
نیا کی کہانی

دنیا کی کہانی

محمد مجیب بی۔ اے (آکسن)

مکتبہ جامعہ
دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ

قیمت

طبع اول ۱۹۳۸ء ۲۰۰۰

مطبوعہ جید برقی پریس، دہلی

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ ذرا سی کتاب چند تقریروں کا مجموعہ ہے جو آل انڈیا ریڈیو کی فرمائش پر تیار کی گئی تھیں اور اسی کی اجازت سے اس شکل میں چھاپی جا رہی ہیں۔ اسے تاریخ کہتے ہوئے شرم آتی ہے، اور کہانی میں جو دلچسپی چاہیئے وہ بھی اس میں نام کو نہیں۔ ناظرین کے سامنے یہ صرف اس امید میں پیش کی جاتی ہے کہ یہ انھیں شاید بہتر کتابیں پڑھنے کا شوق دلائے، اور وہ اس دھندلے سے خاکے میں جو کچھ غلط سمجھیں اسے مٹا کر، جو کچھ صحیح ہو اسے قائم رکھ کر اسے بنتے بنتے ایک تصویر بن جانے کا شرف بخشیں۔

محمد مجیب

جامعہ، جون ۱۹۳۸ء



ابوالہول جسے Sphinx بھی کہتے ہیں۔ قدیم دیومالا کی ایک پہیلی
بجھانے والی دیوی

(۱)

دنیا کی کہانی

دنیا کی کہانی ایک عجیب داستان ہی کہ جس کی زبانی بیان ہو اسی کے مطلب کی ہو جاتی ہی۔ وہ بہت لمبی ہے اور بہت چھوٹی بھی۔ بہت سیدھی سادی اور بہت الجھی ہوئی، وہ ہمیں دلاسا بھی دیتی ہے اور اداس بھی کرتی ہی، لبھاتی بھی ہے اور ڈراتی بھی ہے۔ وہ ان کہانیوں کی طرح ہے جنھیں بچے ضد کرکے رات کو سونے سے پہلے سنتے ہیں اور سنتے سنتے سو جاتے ہیں۔ وہ کہیں سے شروع نہیں ہوتی اور کہیں پر ختم نہیں ہوتی اس میں جو سچی باتیں ہیں وہ کہانی معلوم ہوتی ہیں اور بہت سی باتیں جنھیں ہم سچ سمجھتے ہیں جی بہلانے کے قصے ہیں، وہ ہم میں سے ہر ایک کی آپ بیتی بھی ہو سکتی

ہے اور ایک تماشا بھی ہے کہ جس میں آدمی کی صورت کی بس ایک جھلک سی دکھائی دیتی ہے، ایسی کہ ہم کہہ نہیں سکتے کہ اسے دیکھا یا نہیں دیکھا۔

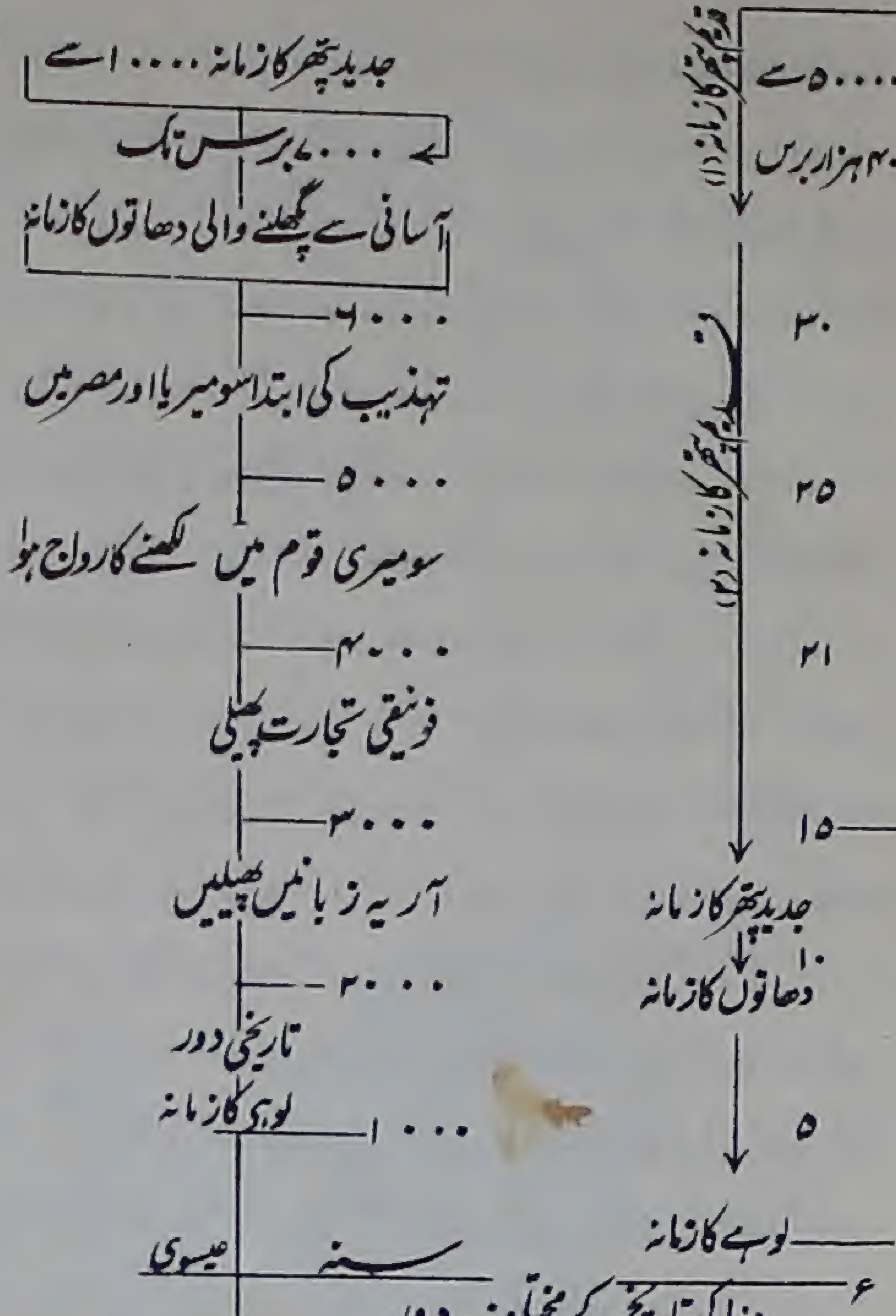
تو میں اس کہانی کو جس کا سرا کہیں نہیں ملتا کہاں سے شروع کروں! اس وقت سے جب دنیا پیدا ہوئی؟ یعنی کب سے؟ بچوں کو تو ہم سمجھا دیتے ہیں کہ اس دنیا کو خدا نے بنایا۔ کب بنایا؟ کیسے بنایا؟ کیوں بنایا؟ یہ ہم نہیں بتاتے اس لئے کہ ہم خود جانتے نہیں۔ لیکن ہر زمانے میں عقلمند لوگ اپنی لاعلمی کو چھپانے اور کم سمجھ رکھنے والوں کی تسکین کے لئے کوئی نہ کوئی دلچسپ کہانی سنا دیتے ہیں، سنسار کے بھیدوں پر کوئی ایسا خوبصورت پردہ ڈال دیتے ہیں کہ ہم پردے کو دیکھتے رہ جائیں اور یہ پوچھنا بھول جائیں کہ اس کے پیچھے کچھ ہے بھی یا نہیں۔ آج کل کے عقلمند لوگ کہتے ہیں کہ ہماری دنیا پہلے ایک آگ کا گولا تھی، اس آگ کا نہیں جو ہمارے گھروں میں جلتی ہے، اس آگ کا بھی نہیں جو ہمارے دلوں کو گرم رکھتی ہے اور کبھی کبھی جلا کر بھسم بھی کر دیتی ہے۔ یہ ایک اور ہی آگ تھی جو بن جلائے جلی اور بن بجھائے بجھ گئی۔ شاید یہ وہ چیز تھی جسے ہم بجلی کہتے ہیں۔ شاید نہیں بھی تھی۔ لیکن کبھی نہ کبھی دنیا آگ کا گولا تھی ضرور، کیونکہ ہمیں ایسے لاکھوں اور کروڑوں آگ کے گولے آسمان میں جگمگاتے دکھائی دیتے ہیں اور ہماری زمین پر اب بھی آتش فشاں

پہاڑ جب چاہتے ہیں تو دہکتی آگ اُگل دیتے ہیں یا زمین کے اندر سے کھولتے پانی کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ دوسرے آگ کے گولے جو دنیا سے بہت بڑے اور بہت زیادہ پرانے ہیں اب تک آگ ہی آگ ہیں۔ دنیا میں یہ آگ پانی اور زمین کیوں بن گئی؟ یہ ہمیں نہیں معلوم، بس ہماری قسمت میں کچھ یہی لکھا تھا۔

ہاں، تو پھر ایک وقت آیا جب دنیا سرد پڑ گئی، بھاپ اور دوسری گیسیں پانی ہو گئیں، جو زیادہ ٹھوس حصہ تھا وہ چٹان بن گیا۔ یہ سب ہوا کب؟ آج کل کے عقلمند زمین کی ساخت سے، چٹانوں اور دھاتوں سے کچھ حساب لگا سکتے ہیں۔ لیکن یہ حساب سنکھ دس سنکھ برس کے بھی آگے نکل جاتا ہے، اور ہم ایسے ہیں کہ کل پرسوں کی بات بھی بس یوں ہی سی یاد رکھتے ہیں۔ بیچارے آدمی کی کھوپڑی میں سائنس کا یہ حساب سما نہیں سکتا، اور جب سما نہیں سکتا تو اسے یہ حساب بتانے سے فائدہ کیا! لیکن عقلمندی بھی ایک چیز ہے اور شاید یہ بھی ایک طرح کا علم ہے کہ جس میں آدمی کہہ سکے کہ میں جانتا ہوں مگر سمجھتا نہیں، اس لئے کہ میری سمجھ چھوٹی ہے اور علم بہت بڑا۔ میں اپنے چُلّو سے اس سمندر کو ناپ نہیں سکتا تو نہ سہی پر میں جانتا تو ہوں کہ اس میں کتنے چُلّو پانی ہے اور کوئی میرے حساب کو

غلط ثابت نہیں کر سکتا۔ سائنس کا حساب بالکل چوکس ہے، فرق نکلا بھی تو کروڑ دس کروڑ کا ہوگا، اور وہ کوئی بات نہیں۔ لیکن کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ ایسا حساب کتاب کرنے والوں سے وہ لوگ زیادہ سمجھتے اور زیادہ جانتے ہیں جن کا یہ ایمان ہے کہ اس دنیا جہان کو خدا نے بنایا اور اس کا ہر ذرہ اس کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ اور اب تو وہ سائنس داں بھی جو اپنے علم کو ایک ڈھکوسلا نہیں بنانا چاہتے کہتے ہیں کہ ہمارا حساب کا طریقہ ایک خاص حد کے آگے کام نہیں دیتا، ہم اپنے علم سے نہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ سورج چاند تارے اور ہماری یہ دنیا خود بخود پیدا ہو گئی نہ یہ کہ اسے کسی نے پیدا کیا۔

دنیا جب سرد پڑ گئی تھی تو کہیں سے سمندر کی تہ میں زندگی کا بیج پہنچ گیا۔ وہاں وہ پھٹا، اور پھلا پھولا۔ لاکھوں کروڑوں برس اس نے طرح طرح کے بھیس بدلے، آہستہ آہستہ یعنی وہی لاکھوں کروڑوں برس میں اس نے پودوں اور کیڑوں کی صورت میں خشکی کی طرف قدم بڑھایا۔ پانی کے بغیر یعنی سانس لے کر زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کی۔ پودے اونچے ہونے لگے اور سر اٹھا کر آسمان کی طرف لپکے۔ جو کیڑے تھے وہ مچھلی بن کر تیرے، اتھلے پانی میں پاؤں کے بل چلنے لگے، خشک زمین پر



دنیا کی تاریخ کے مختلف دور

رینگنا شروع کیا، ہوا میں پرند بن کر اُڑے، چوپاؤں کا روپ لے کر دوڑنے پھرنے لگے۔ کہتے ہیں کہ اُتھلے پانی اور خشکی میں زندگی نے جو یہ ابتدائی شکلیں پائیں وہ بڑی بھیانک تھیں، چالیس پچاس فٹ لمبے مگرمچھ، بیس بیس ہاتھ اونچے ہاتھی، کسی جانور کی گردن اتنی لمبی کہ ہوا میں اڑتے پرندوں کو پکڑ لے کسی کا منہ اتنا بڑا کہ آجکل کی گائے بھینس کو نگل جائے اور ڈکار نہ لے۔ ایک جانور کی ہڈیاں ملی ہیں جو منہ سے دُم کے سرے تک سنّو فٹ سے زیادہ لمبا ہوگا۔ ان جانوروں کو جو نام دئے گئے ہیں وہ بھی ایسے ہی بھیانک ہیں۔ برنٹوسورس Brontosaurus, اکتھیوسورس Iohthyosaurus, میگیلوسورس Megalosaurus. وغیرہ۔

لیکن دنیا کو شاید اپنی یہ اولاد پسند نہ تھی، یا یہ جانور بڑھتے بڑھتے ایسے بے ڈول ہو گئے کہ زندہ رہنا دشوار ہوگیا۔ بہر حال وہ غائب ہو گئے اور جب تک آج کل کے سائنس دانوں کو ان کی ہڈیاں نہیں ملیں کسی کو پتہ بھی نہ تھا کہ ایک زمانے میں ایسے دیو اور اژدہے ہماری دنیا میں آباد تھے۔

خشکی پر ان بڑے جانوروں کے بعد جو نئے نمونے نظر آئے وہ تھے تو ایسے ہی ڈراؤنے مگر ان میں آجکل کے جانوروں کی طرح یہ صفت تھی کہ وہ اپنے بچوں کو شروع میں دودھ پلا کر پالتے تھے۔ ایسے جانور شاید اس لئے

ارتقا پر ایک سرسری نظر

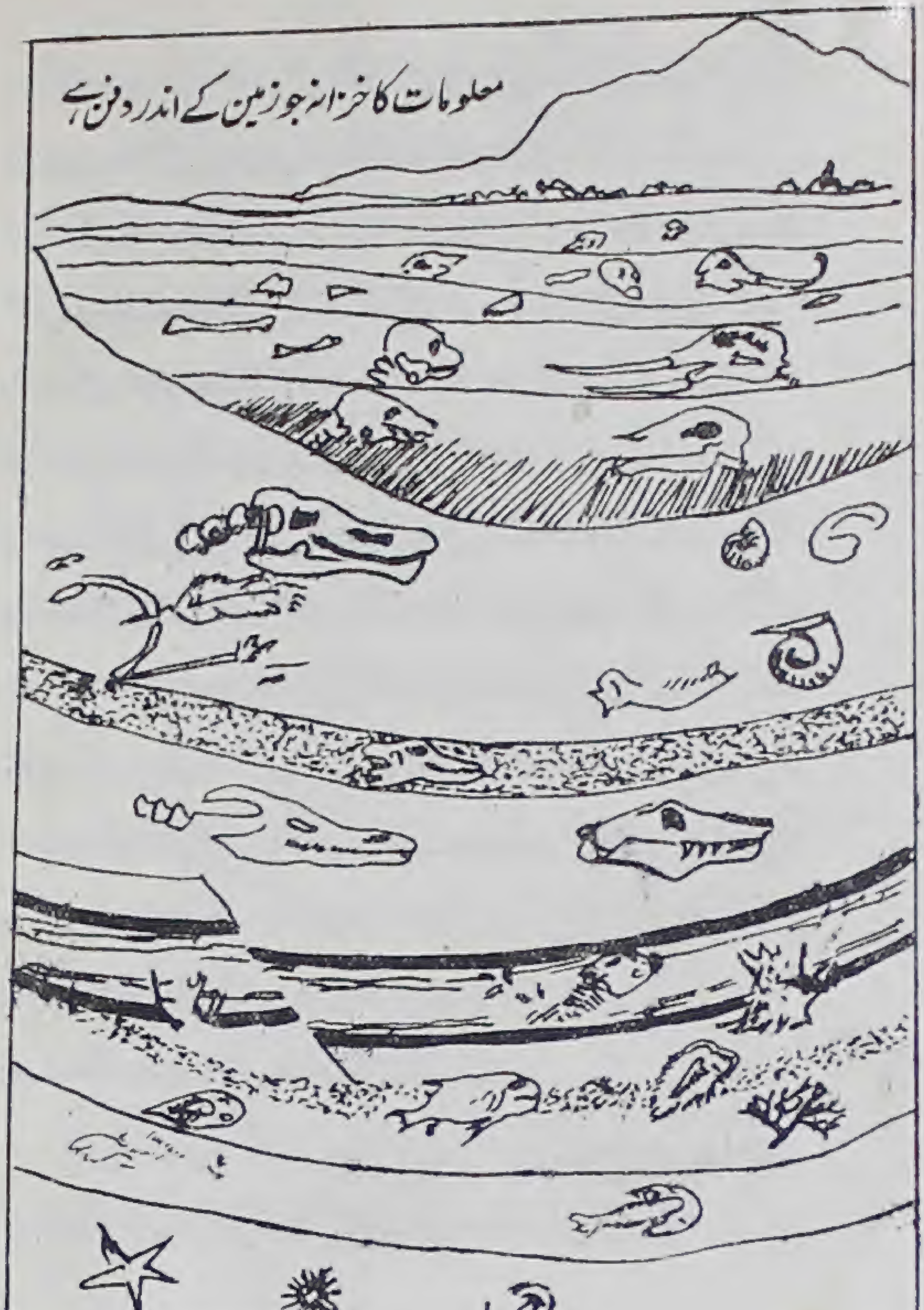


کہ وہ غولوں میں رہتے تھے، ماں باپ کو اولاد سے محبت تھی اور وہ اپنے بچوں کی حفاظت کرتے تھے، پہلی قسم کے جانوروں سے زیادہ سخت جان نکلے اور دنیا کی مصیبتوں کو جھیل لے گئے۔ پھر بھی ان کی بہت سی قسمیں مرمٹیں، جو باقی بچیں ان کے بھی جسموں میں ایسی تبدیلیاں ہوتی رہیں کہ وہ موسم کی سختیوں کو زیادہ اچھی طرح برداشت کر سکیں اور دوسرے جانوروں سے اپنی جان بھی بچا سکیں۔ اسی طرح ترقی کرتے کرتے جانوروں کی ایک قسم نے ایسی شکل پائی ہوگی جو آدمیوں کی شکل صورت سے کچھ ملتی ہوگی جانوروں کی اس قسم کو ہم آسانی کے لئے بن مانس کہہ سکتے ہیں۔ ان بن مانسوں نے چار پیروں کی جگہ دو پیروں سے چلنا سیکھا، اور اگلے دو پیروں سے پکڑنے، اٹھانے اور پھینکنے کا کام لینے لگے۔ قدرت نے ان کی مدد کی اور ان کے اگلے دو پیر نیچے کی طرح ہو گئے۔ ان کی زبان بھی کچھ کھل گئی، اور وہ دوسرے جانوروں سے بہت زیادہ ہوشیار ہو گئے۔

یہ سب ہزاروں برس میں ہوا، اور پھر کہتے ہیں کہ دنیا کی آب و ہوا بدلی، وہ ایسی ٹھنڈی پڑی کہ اس کا بہت سا حصہ برفستان ہو گیا اور برف کے کھسکنے اور پھسلنے پہاڑوں نے سب کچھ اپنے تلے روند ڈالا۔ پھر گرمی آہستہ آہستہ بڑھی، برفستان گھل کر سمندر ہو گئے، اور زندگی پھر ابھری اور پھیلی۔

اس طرح چار مرتبہ ہوا اور اس وقت زمین میں کئی سو گز نیچے تک ہمیں جو کچھ ملتا ہے وہ انھیں گرمی اور سردی کے پھیروں کی داستان سناتا ہے۔ اس زمانے میں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ بن مانسوں کا برا حال ہوا ہوگا۔ ان میں سے بعض کی ایک دو ہڈیاں برف کے نیچے اور جانوروں کی ہڈیوں کے ساتھ دفن ہو گئیں اور اب وہ زمین کے اندر بہت دور پر ملی ہیں جس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کتنے کروڑ یا لاکھ برس پہلے آباد تھے اور ان کے زمانے میں زمین کی صورت کیا تھی۔ لیکن انھوں نے اسی دوران میں شاید دو چار باتیں سیکھ لی تھیں جو بہت کام کی تھیں۔ کہیں جنگلوں کو جلتے دیکھ کر انھوں نے پتہ لگا لیا تھا کہ آگ کیسے جلاتے ہیں، اور پھر وہ اپنی کھوہوں اور غاروں میں آگ جلا کر تاپنے لگے اور اس میں جانوروں کا گوشت اور شاید چند پھلوں اور جڑوں کو بھوننے لگے۔ وہ پتھروں کو گھس کر ان سے بھونکنے، چھیلنے اور کاٹنے بھی لگے اور اس نے ان کی زندگی کو کچھ اور آسان کر دیا۔ آج کل کا علم ہمیں بتاتا ہے کہ ہم انھی بن مانسوں کی اولاد ہیں اور جیسے جانور ترقی کرتے کرتے بن مانس ہوئے تھے ویسے ہی بن مانس آدمی ہو گئے۔

لیکن آج کل کا علم ان بن مانسوں کی کسی ایک قسم سے ہمارا رشتہ نہیں جوڑتا۔ ہیں تو ہم ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے لیکن ہم جس خاص نمونے پر


معلومات کا خزانہ جو زمین کے اندر دفن ہے

بنے ہیں اس کی پہلی مثالیں ابھی تک نہیں ملی ہیں۔ جاوا میں ایک جگہ پر ایک کھوپڑی کا اوپر کا حصہ، تھوڑے سے دانت اور جبڑے کی ہڈی ملی ہے یہ ایک ایسے جانور کی ہڈیاں معلوم ہوتی ہیں جس کا بھیجا بندر کے بھیجے سے کچھ بڑا یعنی اس کی عقل بندروں سے کچھ زیادہ تھی، جو دو پیروں پر کھڑا ہو سکتا تھا اور دوڑ سکتا تھا، اور اس لئے وہ اپنے ہاتھوں سے کام لے سکتا تھا جرمنی کے ایک شہر ہائڈل برگ کے قریب اسی فٹ کی گہرائی پر جبڑے کی ایک ہڈی ملی ہے، اور بنانے والوں نے اس پر غور کرتے کرتے ایک جانور بنایا ہے، جو اس جانور کے مقابلے میں جس کی ہڈیاں جاوا میں ملی ہیں آدمی سے زیادہ



بن مانس جس کی ہڈیاں نیانڈرتھال
میں ملی ہیں

ملتا ہے۔ مگر نہیں آدمی یہ بھی نہیں، بس اس کے دانت ایسے ہیں جن کی مثال جانوروں میں نہیں پائی جاتی، وہ کسی طرح کے آدمی ہی کے ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ انگلستان کے ضلع سسکس میں ایک کھوپڑی کے ریزے اور ٹکڑے اور جبڑے کی ہڈی اتفاق سے ہاتھ لگی ہے۔ اس کی مدد سے بھی ایک شکل بنائی گئی ہے، میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آدمی کی یا بندر کی، اس لئے کہ شکل بنانے والے خود فیصلہ نہیں کر سکے ہیں۔ بہر حال وہ ایک طرح کے بن مانس کی شکل ہے، آدمی سے اس کا کتنے قریب یا دور کا رشتہ تھا اس کا ہم ٹھیک اندازہ نہیں کر سکتے۔

ہڈیوں سے آدمی بنانے کا یہ جو فن ہے اس کے عالم کہتے ہیں کہ ہم جیسا کہ چاہئے تلاش بھی نہیں کر سکے ہیں۔ ابھی تک صرف یورپ اور امریکہ میں لوگوں کو اس مسئلے سے دلچسپی ہوئی ہے، یہ دنیا کے ایسے حصے ہیں جہاں ہمیشہ سے سردی زیادہ رہی ہے، اور شروع میں آدمی کو ایسی جگہ زندگی بسر کرنے میں بے انتہا دشواریاں ہوئی ہوں گی۔ تلاش کرنے کی جگہیں اصل میں جنوبی اور جنوب مغربی ایشیا، افریقہ، جنوبی امریکہ، آسٹریلیا وغیرہ ہیں، اور یہاں ابھی بہت کم کام ہوا ہے یا بالکل ہی نہیں۔ یہاں اگر کافی شوق اور محنت سے کھوج کی جائے تو ہمیں ضرور ایسے آثار ملیں گے

جن سے ہمارے علم کی کمی پوری ہو جائے گی اور آدمی اور جانور کا رشتہ ثابت اور مضبوط ہو جائے گا۔

اب ایک بڑی مشکل بحث یہ ہے کہ یہ عالم جو آدمی کو بن مانس کا سگا بتاتے ہیں اور وہ مذہب جو آدمی کو آدم کی اولاد ٹھیراتے ہیں اور آدمی کی کہانی اس وقت سے شروع کرتے ہیں جب حضرت آدم جنت سے نکالے گئے، یہ دونوں ایک ہی بات اپنے اپنے طریقے سے کہتے ہیں یا مختلف باتیں جن میں سے ایک غلط اور ایک صحیح ہے۔ میرے خیال میں حجت کرنے کی نوبت نہ آئے گی اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ مذہب علم کی ایک الگ اور اعلیٰ قسم ہے۔ اس علم کو حاصل کرنے کے ذریعے اور ہیں اور اس کا مقصد اور۔ مذہب کو اس سے کوئی مطلب نہیں کہ کس جانور کی ہڈیاں کیسی ہوتی ہیں، اور اگر وہ اس گہرائی پر اور اس تہ میں ملیں تو اتنے زمانے کی ہیں اور اس کے اوپر ملیں تو اتنی پرانی۔ مذہب میں وقت کوئی چیز نہیں، جو کچھ ہے زندگی ہے، مذہب کی نگاہ زمین پر نہیں ہوتی، آسمان پر ہوتی ہے، آدمی کے جسم پر نہیں ہوتی، اس کے دل پر ہوتی ہے، مذہب کے لئے مطلب کی بات وہ ہوتی ہے جو آدمی کو بہتر آدمی بنائے، اس کے لئے سچ وہی ہے جو سچائی کا حوصلہ پیدا کرے۔ دراصل سچے علم اور سچے مذہب میں اختلاف نہیں ہوتا، اختلاف تو ایک طرف وہ لوگ پیدا کرتے ہیں جو

بغیر علم حاصل کئے مذہبی رہنما بنا چاہتے ہیں، دوسری طرف وہ جو مذہب کی اصلیت کو سمجھے بغیر اپنے علم کو اس کے مقابلے پر کھڑا کر دیتے ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ سکتے، ہم ان کے جھگڑوں میں پڑے تو ہماری سمجھ میں بھی کچھ نہ آئے گا۔

اب سے آٹھ دس ہزار برس پہلے تک دنیا کی کہانی جو سائنس ہمیں سناتی ہے، ہماری کہانی نہیں ہے، اس لئے کہ اس وقت ہمارے جیسے انسان جنھیں نیکی اور بدی کا علم تھا پیدا نہیں ہوئے تھے۔ قدرت نے کس طرح کروڑوں برس میں بناتے بناتے آدمی کی شکل بنائی اس کا بھی ہماری آپ بیتی سے کوئی تعلق نہیں، کہ ہماری آپ بیتی تو تبھی سے شروع ہو سکتی ہے جب سے ہم نے اپنے آپ کو پہچانا۔ یہ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ انسانی برادری کو ایک قدیمی انسان کی اولاد بتانا زیادہ صحیح ہے یا اسے بیسیوں ایک دوسرے سے بیر رکھنے والی نسلوں میں تقسیم کرنا، فقط اس ضد میں کہ اس قدیمی انسان کی نہ کہیں ہڈیاں ملی ہیں اور نہ کسی پتھر پر اس کا نام کھدا ہوا ملا ہے۔ سائنس یقین کے ساتھ نہیں بتلا سکتی کہ آدمیوں کی پہلی نسل کون تھی اور کہاں تھی، تو پھر سائنس سے یہ کیوں پوچھئے کہ حضرت آدم کوئی بزرگ تھے بھی یا نہیں۔

بہر حال اب سے آٹھ دس ہزار برس پہلے سے تو ہمیں کچھ نہ کچھ معلوم

ہے کہ دنیا میں کیا ہوتا رہا۔ اب آگے اپنی کہانی سنئے اور فضول جھگڑوں میں نہ پڑیئے

علم الارض کی رو سے دنیا کی زندگی کے دور۔

Azoic. بغیر حیات:۔ اس دور کے کوئی آثار نہیں ملتے یہ دور اب سے ۸ ارب یا ۸۰ کروڑ برس پہلے گذرا۔

Proterozoic. ما قبل حیات:۔ اس زمانے میں زندگی کی ابتدا نہیں ہوئی تھی، پانی پر کائی تھی اور شاید جیلی مچھلی۔ یہ دور اب سے ۶ ارب یا ۶۰ کروڑ سال پہلے گذرا۔

Palaeozoic. ابتدائی زمانہ حیات:۔ اب تک ایسے کیڑے نہ تھے جن کے ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔ یہ دور اب سے ۳ ارب ۶۰ کروڑ یا ۳۶ کروڑ سال پہلے گذرا۔

Later Palaeozoic. ابتدائی زمانہ حیات کا دوسرا دور:۔ یہ مچھلیوں اور پیر سنے والے پرندوں کا زمانہ تھا۔ یہ دور اب سے ۲ ارب ۶۰ کروڑ یا ۲۶ کروڑ برس پہلے گذرا۔

Mesozoic. درمیانی زمانہ حیات:۔ یہ بڑے رینگنے والے جانوروں کا زمانہ تھا، اور اب سے ۱ ارب ۴۰ کروڑ یا ۱۴ کروڑ برس پہلے گذرا۔

Cainozoic. جدید زمانہ حیات:۔ یہ دودھ پلانے والے جانوروں کا زمانہ ہے۔ اب سے ۴۰ کروڑ یا ۴ کروڑ برس پہلے شروع ہوا۔

(۲)

دنیا کی پہلی تہذیبیں

دنیا کی کہانی میں حضرت آدم کا زمانہ وہ وقت ہے جب آدمی جانور سے انسان ہوا۔ سائنس کے پجاری حضرت آدم کو نہیں مانتے۔ لیکن یہی لوگ جب پرانی قوموں کے عقیدوں اور دھرم کو بیان کرتے ہیں تو ہمیں ہر جگہ کسی نہ کسی شکل میں ایک ایسے بزرگ کا نام ملتا ہے جنھوں نے آدم کی طرح نیکی اور بدی کا پھل چکھ کر، یونانی سورما پرومے تھی ئش کی طرح آسمان سے آگ لا کر اور آدمی کو کھیتی باڑی کا فن سکھا کر، یا یم کی طرح سورگ کا رستہ تلاش کر کے آدمی اور جانور میں ایسا فرق پیدا کر دیا کہ پھر وہ دونوں ایک سے نہ ہو سکیں۔ پرانی قوموں کی روایتوں، پرانوں، یا دیو مالا میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ آدمی کو دنیا آباد کیے بہت دن نہیں ہوئے تھے جب ایک طوفان آیا جس میں تھوڑے

سے لوگوں کے سوا سب ڈوب گئے۔ اگلے وقتوں میں عقل کی دھار اتنی تیز نہیں تھی کہ جہاں پر رکھی جائے وہیں کاٹ دے، شاید لوگ اس دھار سے کاٹنے کے علاوہ اور کام بھی لینا چاہتے تھے، اور اس لیئے ہمیں مذہبی عقیدے اور قصّے کہانیاں، تاریخ اور خیالی باتیں سب ایک میں گتھی ہوئی ملتی ہیں، یا یہ سمجھئے کہ یہ ایک باغ ہے جسے ہم اتنی دور سے دیکھ رہے ہیں کہ چمن میں چمن، رنگ میں رنگ، پھول میں پھول مل جاتا ہے۔ ان قصّے کہانیوں میں کاٹ چھانٹ کرنا بے ادبی معلوم ہوتی ہے یہاں تو بس دیکھئے اور لطف اٹھایئے اور سبق حاصل کیجئے۔

طوفان کی لہروں اور گردابوں میں جب دنیا متھی جا چکی تھی تو زندگی کی اکھڑی ہوئی جڑیں پھر جمنے لگیں، اور کہیں کہیں پر خاصی مضبوط جمیں، دریائے نیل کی وادی میں، جنوبی عراق میں، ہمارے ہندوستان میں دریائے سندھ کے کناروں پر، اور چین میں دریائے ہوانگ ہو اور یانگ ٹسی کیانگ کے دہانوں پر۔ لیکن دنیا کی آبادی بس انھیں بستیوں میں نہیں تھی۔ ایسی بھی بہت سی نسلیں تھیں جنھیں کہیں کوئی ٹھکانا نہیں ملا۔ انھیں خانہ بدوش کہتے ہیں، گویا وہ اپنا گھر بار کاندھوں پر لادے، مویشیوں کو چراتی گھوما کرتی تھیں۔ جب ان کی تعداد بہت بڑھ جاتی یا وہ پھرتے پھرتے بڑی بستیوں کے پاس پہنچ جاتیں تو ان میں اور بستی والوں میں، جنھیں وہ ظاہر ہے لوٹنا چاہتی تھیں خوب لڑائیاں

ہوتیں۔ ان میں آخر کار خانہ بدوش ہی جیتتے تھے، وہ بستی والوں کو مار ہٹاتے اور خود ان کی جگہ آباد ہو جاتے۔ پھر تین چار سو برس بعد کسی اور قوم کے ہاتھوں یہ نئی بستی بھی اجاڑ کر نئے لوگوں سے بسائی جاتی۔ تہذیب کے پرانے مرکز گھڑے بھر پانی میں شکر کے دو چار ڈلے تھے۔ پانی ہلا دیا جاتا تو وہ گھل جاتے پھر جب وہ ٹھہر جاتا تو شکر بیٹھ جاتی۔ لیکن پانی کو ہلانے والے کچھ نہ کچھ مٹھاس اپنے ساتھ بھی لاتے تھے، گھلنے کے بعد جو شکر جمع ہوتی وہ پہلے سے کچھ زیادہ ہی ہوتی، اور گھڑے کا پانی بھی ذرا اور میٹھا ہی ہو جاتا۔ اس طرح تہذیب پھیلتی رہی۔ عراق، مصر، ہندوستان کے علاوہ بحر روم جسے انگریزی میں Mediterranean Sea کہتے ہیں، اس کے ساحل پر فلسطین میں، شام میں، کریٹ کے جزیرے میں، اٹلی کے ضلع ایٹروریا میں، شمالی افریقہ میں، آج کل کے شہر تونس کے قریب تہذیب کے مرکز قائم ہوئے۔ ہمارے عالم ابھی یہ نہیں طے کر پائے ہیں کہ مصر کی تہذیب سب سے زیادہ پرانی ہے یا جنوبی عراق کی سومیری تہذیب، لیکن بہر حال یہ دونوں آٹھ دس ہزار برس پرانی مانی جاتی ہیں، اور ہندوستان کے اندر ہڑپا اور موہنجوڈرو میں جن بستیوں کے نشان ملے ہیں ان میں سب سے پرانی ان سے کچھ کم نہوں گی مصر کے پرانے شہر تھیبز، میمفس اور ہیلی او پولس، جنوبی عراق میں بابل اور شمال

میں نینوا، کریٹ میں شہر کنوسوس تہذیب کے اس دور میں آباد ہوئے اور ہزاروں برس آباد رہے۔

اب سے کوئی چار ساڑھے چار ہزار برس ہوئے کہ ایک نئی نسل جس کا ہمیں نام تک نہیں معلوم ہے اور جو اپنے آپ کو آریہ یعنی پاک اور پوتر کہتی تھی، خدا جانے کہاں سے نکل پڑی۔ اس نے جنوبی یورپ، عراق، ایران اور ہندوستان پر قبضہ کیا، پرانی تہذیب کو کچھ مٹایا، بہت کچھ اختیار کر کے اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ ہندوستانی، ایرانی، یونانی اور رومی آریہ تھے تو سب ایک ہی خاندان کے لوگ، مگر سب نے الگ الگ طبیعت اور مزاج پایا تھا اور سب نے دنیا میں بالکل مختلف یادگاریں چھوڑیں۔ آریوں کا سب سے پہلا سامراج ایران میں قائم ہوا، اور شام سے لے کر ہمارے دریائے سندھ تک پھیلا۔ پھر اسے یونانی آریوں کے مشہور بادشاہ سکندر نے مٹایا، اور اسی کے تھوڑے دن بعد ہندوستان میں موریا سامراج کی بنیاد پڑی۔ یہ ادھر ختم ہوا تھا کہ مغرب میں رومی سلطنت کا ستارہ چمکا۔ اسی زمانے میں نئی خانہ بدوش نسلوں نے منگولیا کی چراگاہوں سے نکل کر ذرا سی مدت میں ہندوستان، ایران، ترکی اور مشرقی یورپ کو برباد اور پھر آباد کیا۔ یہ ہیں شروع سے حضرت عیسیٰ کے زمانے تک کی تاریخ کی موٹی موٹی باتیں۔ اب آیئے اسی زمانے پر

جدید پتھر کا زمانہ

۸۰۰۰ پہلے مکان بنے۔

۷۰۰۰ سومیری تہذیب کی ابتدا

۶۰۰۰

۵۰۰۰ سومیریوں نے لکھنا شروع کیا   مصر کا پہلا شاہی خاندان

۴۰۰۰ قدیم ہندی تہذیب   پہلے اہرام مصر

موہنجو ڈرو اور ہڑپا کے پہلے شہر بنے۔ فونیقی تہذیب کا آغاز

۳۰۰۰ پہلے جہاز بنے۔

عراق، مصر، ہندوستان اور بحر روم کے ساحل پر شہری زندگی۔
فونیقی تجارت کے ساتھ وہ ابجد پھیلی جو انھوں نے عراقی اور
مصری طرز تحریر کو ملا کر تیار کی تھی۔

۲۰۰۰ آریہ زبانیں پھیلیں۔

۱۰۰۰ ایران، ہندوستان اور یونان میں آریہ مذہب اور تہذیب
کی بنا۔ فونیقی تہذیب کا خاتمہ

۵۰۰ ایرانیوں اور یونانیوں کی جنگ

۳۲۰ سکندر اعظم

سنہ عیسوی

دوسرے پہلو سے نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ ان چھ سات ہزار برس میں انسان نے کتنی ترقی کی۔

ہم جسے تہذیب کہتے ہیں اس کے معنی ہیں دین ایمان کے، دھرم، قانون اور علم کے سائے میں زندگی بسر کرنا، اپنی محنت سے اس زندگی کو سرسبز رکھنا، نیک حوصلوں سے اس کو رونق دینا، اور صنعت اور تجارت کے ذریعے سے وہ چیزیں حاصل کرنا جن سے آرام پہنچتا ہے یا جن کی خوبصورتی دل کو خوش کرتی ہے۔ ہر قوم اپنی زندگی اپنی طبیعت اور مذاق کے ڈھنگ پر بناتی اور سنوارتی ہے، مگر پھر بھی آدمی تو ہر جگہ آدمی رہتا ہے، اور اگر نام اور چند خصوصیات کا پردہ ہٹا دیا جائے تو ہمیں ہر جگہ قریب قریب ایک ہی سی زندگی نظر آئے گی۔ مصر، سومیریا، بابل، قدیم ہندوستان اور ایران میں مذہب امید اور خوف کی وہی دو رخی تصویر تھی، اس میں ان قوتوں سے لگاؤ بڑھایا جاتا تھا جو زندگی کو قایم رکھتیں اور اسے پروان چڑھاتی ہیں، ان قوتوں کو رام کرنے کی فکر کی جاتی تھی جن سے نقصان اور موت کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لیکن آدمی ان قوتوں کو پوری طرح جانتا پہچانتا نہیں، وہ اتنی بڑی ہیں اور اسے ہر طرف اس طرح سے گھیرے ہوئے ہیں کہ اس کی عقل حیران رہتی ہے، وہ انھیں طرح طرح کی شکلوں میں تصور کرتا ہے، طرح طرح کے نام دیتا ہے۔ اور جس بات کو

وہ صاف صاف کہہ نہیں سکتا اس لئے کہ وہ صاف صاف سمجھتا نہیں اسے وہ ایک کہانی بنا دیتا ہے۔ پرانی قوموں کی دیو مالا میں ہزاروں ایسی کہانیاں ہیں اور ایسی ملتی جلتی کہ معلوم ہوتا ہے وہ سب ایک ہی حقیقت کو بیان کرنے کی الگ الگ کوششیں ہیں۔

مذہب کے اس شاعرانہ پہلو کے ساتھ ہمیں ہر جگہ دھرم اور قانون بھی شروع ہی سے ملتے ہیں، اور انھیں آپ دیکھئے تو وہ آج کل کے قانون سے بہت مختلف نہیں، بلکہ بعض باتوں میں آج کل سے بہتر بھی ہیں مصر میں اوسی رس اور اس کے بعد کئی بادشاہوں نے، بابل میں شاہ ہمور بی نے، یہودیوں کے لئے حضرت موسیٰ نے، کریٹ کے جزیرے میں می نوس نے مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی یعنی سماجی قانون بنائے۔

شاہ ہمور بی کا قانون ایک پتھر پر نقش کیا ہوا ملا ہے۔ اس میں بعض جرم، جیسے چوری، ایسے ہیں جن کی سزا آج کل بہت سخت معلوم ہوتی ہے بعض باتیں ایسی ہیں کہ ہم ترقی کر کے بھی ان تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ مثلاً یہ کہ شہر میں کسی کے یہاں ڈاکہ پڑے تو حکومت کا فرض ہے کہ مجرم کو پکڑ کر مال واپس پہنچائے یا اپنے پاس سے نقصان پورا کرے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ عورتوں کو بہت آزادی تھی، ان کے حق مردوں سے کسی طرح کم نہ تھے،

ان کو جائداد اور ورثے میں حصہ ملتا تھا، وہ کاروبار کر سکتی تھیں اور کرتی تھیں
اور مصر کی ملکہ ہتھ سے پت اور ملکہ تئی اور بابل کی ملکہ سمی رمس کے حالات
پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان ملکوں میں عورتیں راج پاٹ کی اہل مانی جاتی تھیں یا
مصری قصوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ اپنی عورتوں سے ڈرتے اور دبتے
تھے، اور یہ خیال صحیح نہ ہو تب بھی ہم یہ تو جانتے ہیں کہ مصر اور بابل میں عورتیں
شادی کے بعد شوہر کی ذات یا اس کے خاندان میں گم نہیں ہو جاتی تھیں بلکہ
ان کا اصل رشتہ اپنے ماں باپ ہی سے رہتا تھا اور وہ آسانی سے
طلاق لے سکتی تھیں۔

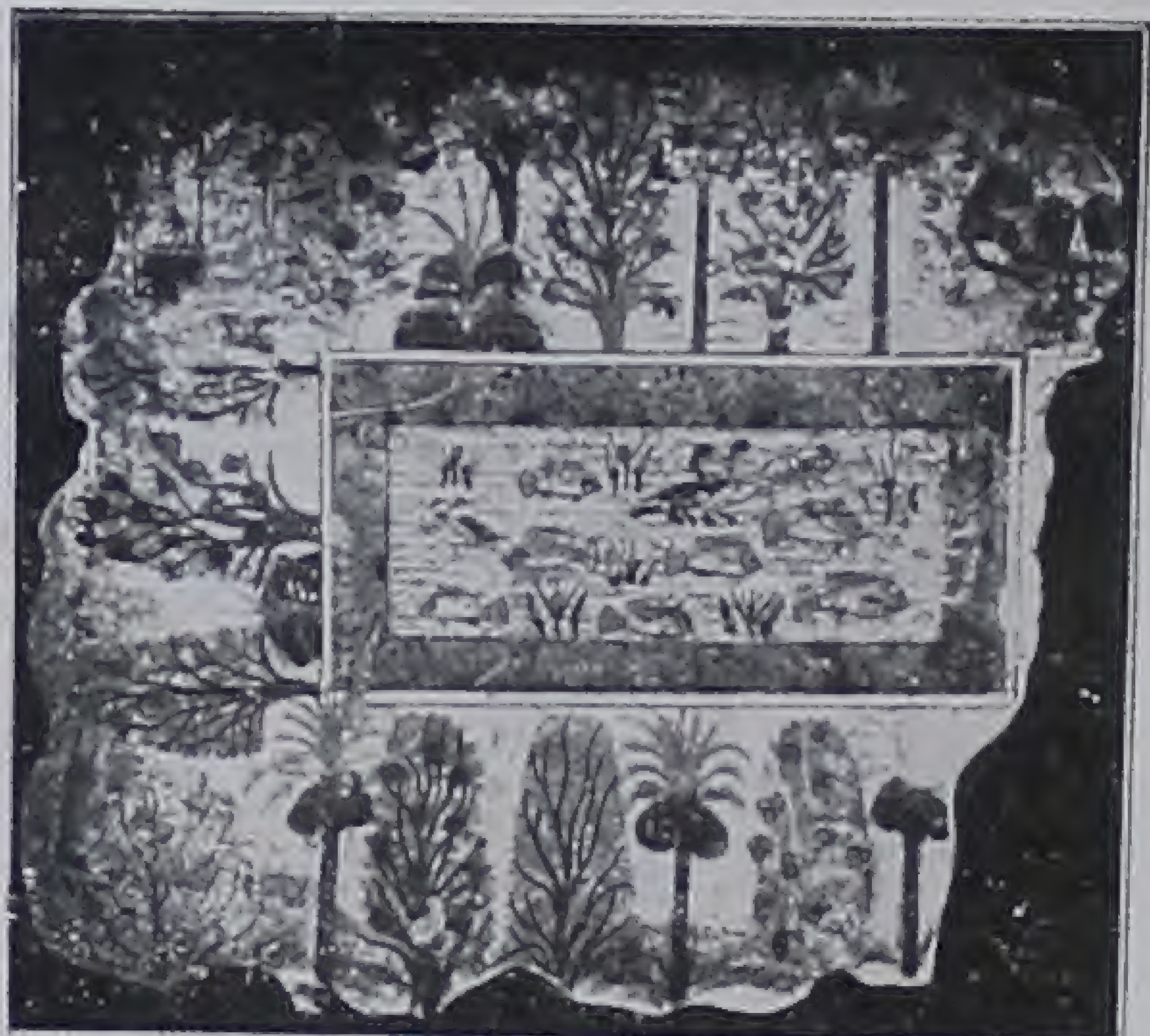
قانون کے بعد ہم اس زمانے کی زندگی کے اور شعبوں کو دیکھیں تو بڑی
حیرت ہوتی ہے۔ مصر اور بابل میں حکومت کی طرف سے آب پاشی کا پورا
انتظام تھا، دریاؤں سے نہریں کاٹ کاٹ کر دور تک پانی پہنچایا گیا تھا
اور سیلاب اور بارش کے پانی کو جمع رکھنے کے لئے بڑے بڑے تالاب بنے
تھے، جان و مال کی حفاظت کو ہر بستی میں پولیس اور شہروں میں فوج تھی، اور
ہم تک مصر اور بابل کے کئی ایسے قصے پہنچے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ
بادشاہ خود قاعدے اور قانون کا بہت لحاظ کرتے تھے اور سرکاری ملازموں
کو ظلم اور زیادتی سے روکتے رہتے تھے۔ مقدموں کا فیصلہ کرنے کو عدالتیں

موجود تھیں اور ان کا مرتبہ ایسا تھا کہ وہ اپنا فرض خوبی سے انجام دے سکتی تھیں۔

قانون اور ملکی انتظام کی طرح اس علم کی جس پر ہم ناز کرتے ہیں اسی زمانے میں داغ بیل ڈالی گئی۔ مصر اور بابل میں لکھنے کا طریقہ ایجاد کیا گیا۔ بابل والے مٹی کی تختیاں بنا کر جب وہ گیلی ہوتیں اسی وقت ان پر ایک نکیلے اوزار سے گڑو گڑو کر لکھتے تھے، پھر تختیوں کو سکھا لیتے۔ جیسا ان کا کاغذ قلم تھا ویسا ہی ان کا خط بھی تھا، اور اگرچہ بابل میں خط و کتابت کی رسم بھی جاری تھی اور لوگ انھی تختیوں کو مٹی کے ڈبوں میں بند کر کے ڈاکیوں کے ذریعے ایک دوسرے کے پاس بھیجتے تھے، لکھنے کے اس طریقے میں بڑی طوالت تھی۔ مصر میں ایک قسم کی نرم تنے کی بانسی ہوتی تھی جسے پی رس کہتے ہیں اور اس کی چھال سے آسانی کے ساتھ ایک طرح کا کاغذ تیار کیا جا سکتا تھا۔ مصری شروع میں تو جس چیز کا ذکر کرنا ہوتا اس کی تصویر بناتے تھے، مگر آہستہ آہستہ انھی تصویروں سے ایک ایسا لکھنے کا طریقہ نکالا گیا جس میں آدمی جلدی اور صفائی سے اپنا مطلب ادا کر سکتا تھا۔ بابل اور مصر کی کوششوں سے فائدہ اٹھا کر ایک قوم نے جو فونیقی کہلاتی ہے پورے پورے لفظوں کی جگہ الگ الگ حرف بنائے جن میں سے ہر ایک کسی خاص آواز کی علامت تھی۔ فونیقی تاجر تھے، انھوں نے تجارت کے ساتھ لکھنے کے اپنے خاص طریقے کو پھیلایا



ملکہ نفر یتھتی



باغ کا ایک منظر- یہ تصویر دیوار پر بنی ہوئی ہے



مصری کرگا

اور چینی اور جاپانی کے سوا دنیا میں جتنی زبانیں ہیں ان سب میں یہی حرف شکلیں بدل کر اور کچھ کمی بیشی کے ساتھ رائج ہوئے۔

لکھنے پڑھنے کے علاوہ اور علم بھی تھے جو اس زمانے میں حاصل کئے گئے۔ وقت کو سالوں میں، سال کو مہینے اور ہفتے، دن کو پہروں میں سب سے پہلے بابل والوں نے تقسیم کیا، اور دھوپ گھڑی سب سے پہلے انھی نے بنائی۔ ستاروں اور برجوں کے نام انھی نے رکھے، اور سبھ گھڑی نکالنے اور ستاروں سے فال دیکھنے کی رسم انھوں نے شروع کی۔ مصریوں نے جنتری بنائی، اور حساب اور اقلیدس یا Geometry میں انھوں نے جو کمال حاصل کیا اس کے ثبوت کے لئے اہرام مصر یعنی Pyramids. موجود ہیں ان میں جو سب سے بڑا ہے وہ سینکڑوں من وزنی پتھروں سے بنا ہے جن کی کل تعداد ۲۰ لاکھ کے قریب ہوگی۔ یہ پتھر بغیر چونے مسالے کے ایسی صفائی سے بٹھلائے گئے ہیں کہ ان کے جوڑ مشکل سے دکھائی دیتے ہیں اور ہزاروں برس میں اپنی جگہ سے رتی بھر بھی نہیں سرکے ہیں۔ یہ عمارت نیچے ۷۶۴ مربع فیٹ ہے اور اونچائی میں ۴۸۰ فیٹ یعنی قطب مینار سے کوئی دو سو فیٹ زیادہ ہے جن لوگوں نے ایسے وزنی پتھروں کو کاٹ کر اور تراش کر اتنی بلندی پر پہنچایا وہ اناڑی نہیں تھے، اور ان کی اس یادگار کو دیکھ کر ہمیں اپنے

علم پر زیادہ گھمنڈ نہ کرنا چاہیے۔ کہتے ہیں کہ بابل میں بھی ایسی ہی ایک اونچی اور عالی شان عمارت تھی، مگر آسمان نے اس کی بلندی پر رشک کھا کر اسے زمین سے ملا دیا۔

جہاں ایسی عمارتیں بنائی جا سکتی تھیں وہاں سمجھے خوبصورت شہر اور مکان بنانا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ مصر، عراق، کریٹ اور ہمارے ہندوستان کے اندر موہنجوڈرو اور ہڑپا میں شہر کے شہر زمین سے کھود کر نکالے گئے ہیں۔ ان کے کھنڈروں سے ہم اس رونق کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے جو زندگی اور آبادی کے ساتھ آتی اور جاتی ہے، مگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ شہر پھیلاؤ میں آج کل کے شہروں سے کچھ کم نہیں، مکان اینٹ اور چونے کے بنے ہوئے اور تین تین چار چار منزل اونچے ہیں، سڑکیں چوڑی ہیں اور گندے پانی کی نکاسی کا اچھا انتظام ہے۔ اب اس میں کیا شک ہو سکتا ہے کہ جو لوگ یہاں رہتے تھے وہ نہایت ہی شائستہ تھے۔ ان کھنڈروں میں ہمیں بہت ہی خوش نما برتن اور زیور ملے ہیں، اور جس طرح آج کل ایک ملک کی بنی ہوئی چیزیں دوسرے ملکوں میں پہنچتی ہیں ویسے ہی اس وقت بھی ایک جگہ کی چیز دوسری جگہ جاتی تھی، ایک جگہ کے فیشن اور رسم کی دوسری جگہ نقل کی جاتی تھی، ریل اور ہوائی جہاز نہ ہونے پر بھی اس زمانے کی دنیا تنگ یا چھوٹی نہیں تھی۔

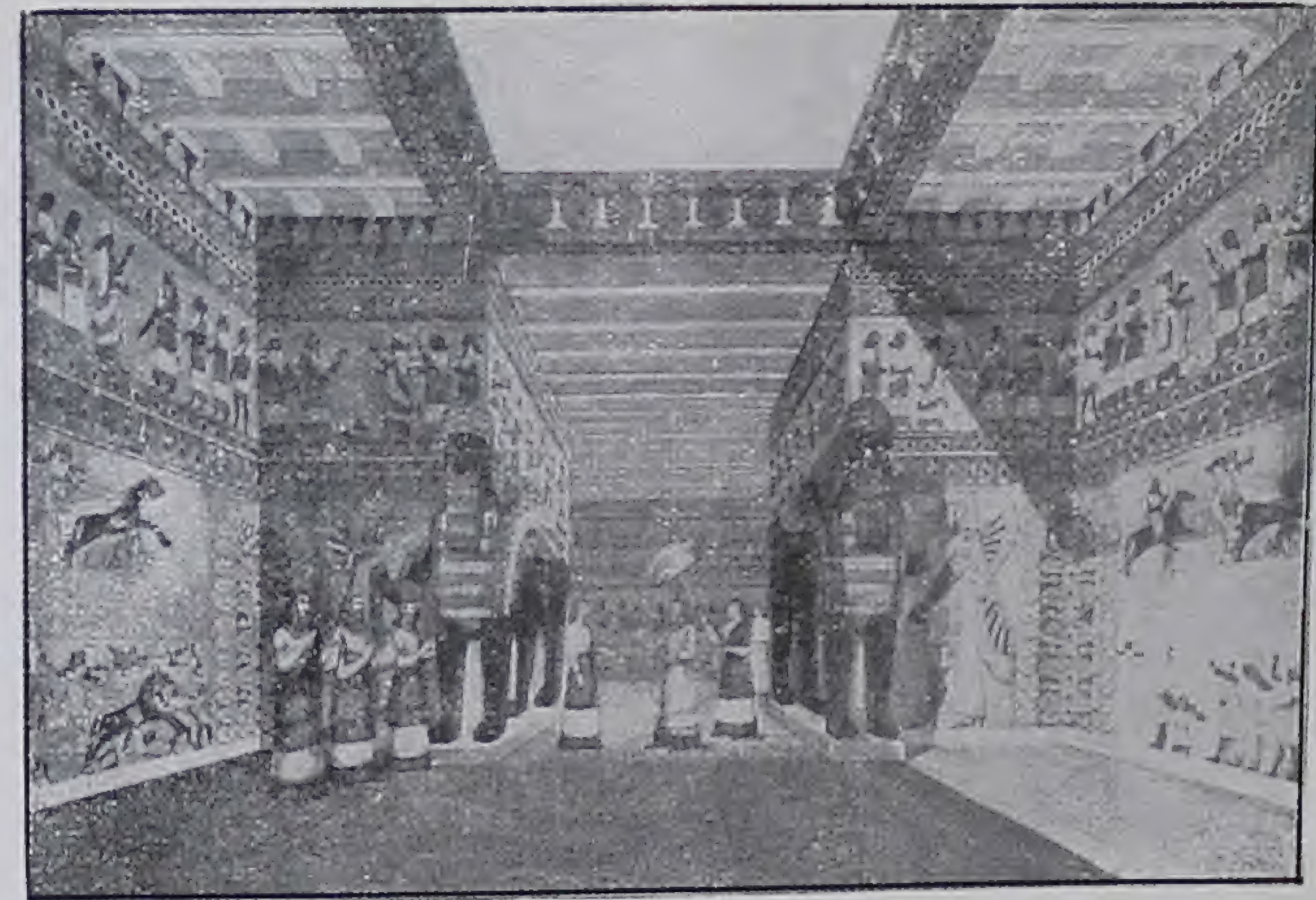
سب سے زیادہ تعجب تو اس وقت ہوتا ہے جب ہم مورتوں اور تصویروں میں اس زمانے کے لوگوں کی صورتیں دیکھتے ہیں، اور ان کی صحبتوں اور دلچسپیوں کا نقشہ ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ عراق، مصر اور کریٹ کے لوگوں نے بس یہی نہیں کیا کہ ایسے قانون اور زندگی کے ایسے اصول بنائے جن سے ان کی تہذیب ہزاروں برس قائم رہی، یا علم اور فن کو ایسے درجے پر پہنچایا کہ ان کے کارنامے دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیں زندگی کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کا انھوں نے ایسا انتظام کر لیا تھا کہ انھیں اپنی معاشرت کو طرح طرح کی نفاستوں سے سنوارنے کا موقع تھا۔ ان کی صورتوں سے شائستگی ٹپکتی ہے، وہ مہذب میل جول کے آداب سے واقف تھے، ان کی عورتوں نے وہ تمام ترکیبیں معلوم کر لی تھیں جن سے ناک نقشے یا ڈیل ڈول کی کسر پوری کی جاتی ہے، اور آرائش کے اس فن کے قدرداں بھی کم نہ تھے۔ دریا اور باغوں کی سیر، دعوتیں، محفلیں یہ سب روزمرہ کی باتیں تھیں اہل فن کی قدر، پردیسیوں کی خاطر مدارات، محتاجوں کی مدد، اس میں ہم آج کل تک کوئی ایسا ڈھنگ نکال نہیں سکے ہیں جس کی انھیں خبر نہ تھی۔ تہذیب کا اجالا جیسا اب ہے ویسا ہی کچھ تب بھی تھا۔

(۳)

مشرق اور مغرب

شروع کے تین چار ہزار برس میں آدمی نے جو تہذیبی دولت کمائی، اپنے آپ کو جس طرح سدھارا، اور اپنی زندگی کو سنوارا وہ میں بیان کر چکا ہوں۔ اس کے بعد کی جو تاریخ ہے اس میں یہی سرمایہ دوبارہ کاروبار میں لگایا گیا، کچھ نیا مال لین دین میں آیا، کچھ نئی منڈیاں تلاش کی گئیں اور دنیا کا بازار پھر گرم ہوا۔

ہماری کہانی کا سلسلہ اب آریوں کے آنے سے شروع ہوتا ہے، یعنی کوئی چار ہزار برس پہلے سے، جب آریوں نے جنوبی یورپ، ایشیائے کوچک، ایران اور ہندوستان پر قبضہ کیا۔ صرف سامی نسلیں، یعنی وہ لوگ جو شام، فلسطین اور عرب میں آباد تھے، آریوں کے اثر سے کسی قدر بچے رہے، ورنہ ہمیں آریوں سے پہلے کی تہذیب کا جو حصہ ورثے میں ملا ہے اس پر



اسیریا (اشور) کا ایک مندر



کریٹ کی ایک تصویر

آریوں کی دھرگی ہوئی ہے اور وہ انھیں کی دین معلوم ہوتی ہے۔ اب بڑی محنت اور سراغ رسانی کے بعد پتہ چلا ہے کہ یہ مکان جسے آریہ اپنا خاندانی گھر کہتے آئے ہیں اصل میں ایک سرائے ہے جہاں بہت سے مسافر ٹھہر چکے ہیں، اور اس جائداد پر جو آریہ اپنے سپوتوں کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ بہتیروں کا حق پہنچتا ہے۔ ہندوستان میں دیکھئے تو دراوڑ برابر کے حصے دار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ہندوستان کے باہر یونانیوں کی تہذیب آریوں کی مالا کا سب سے آب دار موتی، معلوم ہوا ہے کہ کہیں اور کی سیپ میں نکلا تھا، اگرچہ آب اسے یونانیوں نے دی۔ یہ سب سہی، پھر بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آریوں کے زمانے میں دنیا کا وہی رنگ رہا جو پہلے تھا، جدھر بھی آنکھ اٹھایئے ان کے ہاتھوں دنیا کے بگڑنے اور بننے کے آثار نظر آتے ہیں۔

یہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے کہ ہر مخالفت مذہبی مخالفت بن جاتی ہے، اس لئے کہ مذہب ایسی چیز ہے جس کی آڑ ہر اچھی اور بری غرض، اچھا اور برا حوصلہ، ہر ضد اور ہر ضرورت، ہر تعصب اور ہر عقیدہ لے سکتا ہے۔ آریہ چونکہ سرد ملکوں کے رہنے والے تھے اس لئے آگ کی قدر کرتے کرتے آتش پرست ہو گئے تھے، مگر وہ آئے ایسے ملکوں میں جہاں گرمیوں میں آگ برستی تھی اور جہاں سورج کے سامنے صبح شام سر جھکا لینا آگ کا احسان ماننے

کے لئے کافی تھا۔ اس طرح وہ دشمنی جو لڑائی میں ہارنے اور جیتنے والے کے درمیان ہو ہی جاتی ہے مذہبی عداوت بن گئی۔ آریوں نے اپنے سے پہلے کے لوگوں کو بے دین اور ناپاک ٹھہرایا اور اپنی بات پر انھیں اتنا یقین تھا کہ بعد کی نسلوں کو بھی انھوں نے اپنا ہم خیال بنا لیا۔ لیکن اب ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ آریوں کے دشمن بے دین اور ناپاک نہیں تھے اور یہ بھی ظاہر ہو گیا ہے کہ مذہب اور تہذیب میں آریہ اپنی دشمنی کو برت نہیں سکے۔ کیا ہندوستان اور کیا یونان اور ایران، جہاں دیکھئے الگ الگ دیوتاؤں کی جگہ ایک دیوتا کے بہت سے نام ہو گئے، الگ الگ مذہبوں کی جگہ ایک مذہب ہو گیا جس میں سب کے عقیدے اور رسمیں شامل تھیں۔ ہم تک جو چیز پہنچی وہ مکمل تھی، اس میں کہیں جوڑ کا پتہ نہیں تھا اور آریوں نے اسے اس طرح اپنا لیا تھا کہ اس میں غیروں کے عقیدوں اور جذبات کے موجود ہونے کا ہمیں سان گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔

لیکن تعجب ہے کہ دوسروں کے مذہبی خیالات سے اتنا اثر لینے پر بھی آریوں نے اپنی نسل کو سب سے الگ رکھنے کے لئے بڑے جتن کئے، دنیا میں ایک ایسا فتنہ پیدا کر گئے جس کا نتیجہ ہم اب تک بھگت رہے ہیں اور اب بھی یہ پاپ کاٹے نہیں کٹتا۔ ہندوستان میں ذاتوں کی جو تقسیم ہے اس کی باریکیوں سے

آپ لوگ واقف ہیں، اور اسے سمجھانے کے لئے جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں کہ یہ ذات کی تقسیم نہیں ہے، کام کی ہے، اس کی بدولت سماج ایک مضبوط قلعہ بن گئی جسے اب تک کوئی فتح نہیں کر سکا، یہ سب بھی آپ نے سنا ہو گا۔ اسی کی بدولت ہزاروں لاکھوں آدمی اچھوت بنا کر جانوروں سے بھی زیادہ حقیر اور ذلیل کر دیئے گئے، اور اب سمجھ میں نہیں آتا کہ انھیں آدمیوں کا مرتبہ کیسے دیا جائے۔ نسل کا یہی گھمنڈ ہمیں یونان میں بھی ملتا ہے، اگرچہ یونانیوں کا جن نسلوں سے سابقہ پڑا وہ رنگ میں اور ڈیل ڈول میں ان سے کم نہ تھیں یونانی صاف صاف کہتے تھے کہ حکومت کرنا، شہریوں کی حیثیت اور شہریوں کے حقوق رکھنا خاص حصہ ہم لوگوں کا ہے، اور قدرت کا منشا یہ ہے کہ ہم محنت مشقت کے کام اپنے غلاموں سے لے کر اپنا سارا وقت مہذب دلچسپیوں میں صرف کریں۔ "ہم" سے مطلب آریہ نسل کی ایک شاخ کی شاخ تھی جو ہیلینز Hellenes کہلاتی تھی اور جو ایک خاص وقت میں موجودہ یونان اور ایشیائے کوچک میں سمندر کے کناروں پر آکر آباد ہوئی۔ یہ ہیلینز اپنے ان بھائی بندوں کو جو بلقان اور اس کے اتر میں آباد تھے، وحشی کہتے تھے، مشرق کے سب لوگ ان کے نزدیک "ایشیائی" تھے اور "ایشیائی" سے برا توہین کا لفظ یونانیوں کی لغت میں نہیں تھا۔ یونانی اپنا حق سمجھتے تھے کہ

ان لوگوں میں سے جو بھی لڑائی میں قید ہوں، بازار میں مول ملیں، یا اور کسی طرح قبضے میں آجائیں، انھیں وہ غلام کہیں اور اپنے کھیتوں میں، اپنی دھاتوں کی کانوں میں، اپنے شہروں میں اور گھروں میں، جس طرح چاہیں ان سے کام لیں۔ یونان میں کبھی کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ مصیبت یا افلاس کی وجہ سے خاص یونانی نسل کے لوگ بھی غلام بن جاتے تھے۔ اس سے آزاد یونانیوں کو دردناک ڈراموں اور نظموں کے لئے ایک بہت اچھا موضوع مل جاتا تھا، ان کے عقیدے اور اصول میں فرق نہیں آیا، اور جب تک یونانی آزاد رہے وہ اپنی نسل کے خداداد حق کو جتاتے رہے۔

ہندوستان اور یونان کے سوا آریہ اور کہیں نسل کے امتیاز اور اپنی برتری کو مذہب اور قانون میں شامل نہیں کر سکے۔ ایران کے آریوں کی نسبت ہمیں معلوم بہت کم ہے۔ ہم یہ تو جانتے ہیں کہ ان کے یہاں مذہبی رسمیں ادا کرانے کے لئے پروہت ہوا کرتے تھے، اور پروہت وہی ہو سکتا تھا جس کا باپ پروہت ہو۔ لیکن ایران کے پروہت شاید بادشاہوں اور سپاہیوں کو اس طرح اپنے پھیر میں نہ لا سکے کہ پیشے اور کام کی تقسیم کو ذات کی تقسیم بنا دیں، اور ذات کی تقسیم کو دھرم کی بنیاد ٹھیرائیں۔ ادھر یورپ میں روم کے جو آریہ تھے وہ صرف وقت کی مصلحت دیکھتے تھے، نسل اور خاندان پر





کریٹ کی صنعت کے دو بیش بہا نمونے

گھمنڈ انھیں بھی تھا، لیکن انھوں نے اپنا فائدہ اس میں دیکھا کہ اس گھمنڈ کو دوسروں کے لئے بہت زیادہ ناگوار نہ ہونے دیں۔ رومی سلطنت کے تباہ ہونے پر وہ آریہ قبیلے جو اس وقت تک وحشی سمجھے جاتے تھے میدان میں آئے۔ ان لوگوں میں عیسائی مذہب نے جو کہ یہودیوں یعنی سامی نسل کے لوگوں کا مذہب تھا، نسل کے احساس کو بہت کچھ دبایا، مگر اسے مٹا نہ سکا۔ ابھی دیکھئے ہر ہٹلر اور ان کے پیروؤں نے ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کر دیا ہے کہ آریہ اور غیر آریہ کبھی بھائی بھائی نہیں ہو سکتے، ان کی قسمت الگ ہے، اور غیر آریہ اپنی تقدیر کا لکھا پورا کرنے پر مجبور کئے جائیں گے۔ لیکن اب نسلوں میں فرق کرنا یونیورسٹی کے پروفیسروں کا کام ہو گیا ہے، اور دولت نے دوسروں کی محنت اور ضروریات سے فائدہ اٹھانے کے ایسے ڈھنگ نکال لئے ہیں جو غلامی کے پرانے طریقے سے بہت زیادہ کارآمد ہیں۔ آج کل کے غلام اپنے آقاؤں کے لئے زیادہ سے زیادہ محنت کرتے ہیں اور بجائے اس کے کہ ان کے کھانے کپڑے کا ذمہ آقاؤں پر ہو، وہ اپنے آقاؤں کی بنوائی ہوئی چیزیں خرید کر ان کی دولت دن دونی رات چوگنی کرتے رہتے ہیں۔ پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ آج کل غلام رکھنا قانون کے خلاف ہے۔

آریوں نے نسل کی جو تفریق پیدا کی، اسے دنیا کی اور نسلوں نے سر

جھکا کر تسلیم نہیں کر لیا، بلکہ دنیا کی تاریخ کا جوہر وہ بغاوتیں ہیں جن میں مساوات یعنی آدمی آدمی کے برابر ہونے کی تعلیم دی گئی۔ ہندوستان میں گوتم بدھ نے فلسطین میں عیسائی مذہب نے، اور عرب سے نکل کر اسلام نے مساوات کا جھنڈا لہرایا، اور اس کے نیچے مظلوموں کو پناہ دی۔ ان مذہبوں کا ذکر ہم بعد کو کریں گے، یہاں پر ہمیں انسانوں کی تفریق کے ایک اور پہلو کو جانا ہے جس کا تاریخ پر بہت اثر پڑا، اور جو ہمیں دنیا کی کہانی سمجھنے اور اسے یاد رکھنے میں بڑی مدد دے گا۔ یہ ہے مشرق اور مغرب کا فرق۔ اسے جغرافیے نے یا دنیا کو اتر، دکھن، پورب، پچھم چار حصوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت نے پیدا نہیں کیا، یہ انسانی زندگی کے معنی اور مقصد بتانے، زندگی بسر کرنے کے قاعدے بنانے اور دلوں میں حوصلہ پیدا کرنے کے الگ الگ طریقوں کا نام ہے۔ مشرق اور مغرب دو سرے ہیں جن کے بیچ میں ہماری زندگی چکر لگاتی رہی ہے، جو کبھی مل گئے ہیں، کبھی ٹوٹ کر ہماری دنیا کو آدھی اِدھر آدھی اُدھر گھسیٹ لے گئے ہیں۔ معلوم نہیں مشرق اور مغرب کی یہ تفریق ہماری قسمت میں لکھی تھی یا اتفاق سے پیدا ہو گئی، بہر حال اس کے موجود ہونے میں شک نہیں۔

یہ تفریق ہمیں نظر اس وقت سے آتی ہے جب یونانیوں کو اپنے دیس میں آباد ہوئے کئی سو برس ہو چکے تھے اور وہ وحشی نہیں رہے تھے بلکہ

مشرق	مغرب	سنہ عیسوی
قدیم تہذیبوں کا آخری زمانہ		۱۵۰۰
		۱۰۰۰
	مغرب کا عروج۔ یونانی تہذیب۔ سکندر کی فتوحات۔ رومی سلطنت سارے بحر روم میں پھیلی اور مشرق قریب پر چھاگئی۔	۵۰۰
مشرق کا عروج۔ چینی سلطنت اور تہذیب پھیلی۔ بدھ متی تہذیب پھیلی۔ ایران سلطنت۔ گپت تہذیب کا عروج وزوال۔ اسلام۔ مسلمان مشرق سے مغرب تک چھاگئے اور مشرق قریب کے تجارتی رستے ان کے قبضے میں رہے۔		سنہ عیسوی
		۵۰۰
		۱۰۰۰
	مغرب کا عروج۔ تجارت کے نئے رستے۔ سیاست اور صنعت میں انقلاب۔ جدید یورپی تہذیب	۱۵۰۰
		۱۹۳۸

آس پاس کی قوموں سے کچھ سیکھ کر اور اسے اپنی طبیعت کے مناسب رنگ دے کر انھوں نے ایک نئی تہذیب کی بنیاد رکھی تھی، اور اسے ترقی دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسی زمانے میں ایرانی آریوں کی قوت بڑھ رہی تھی اور جب ایرانی سامراج مغرب کی طرف پھیلتے پھیلتے بحرِ روم کے ساحل تک پہنچا، جہاں یونانی آباد تھے، تو دونوں میں ٹکر ہوگئی۔ دیکھنے میں تو دونوں کا کوئی مقابلہ نہیں تھا، لیکن یونانیوں نے پہلے ۴۹۰ ق م میں اور پھر اس کے دس برس بعد ایرانیوں کو شکست دی، اور ان لڑائیوں کو کوئی ڈیڑھ سو برس ہوئے تھے جب سکندر اعظم نے ایران کی عظیم الشان سلطنت کو نیست و نابود کر دیا۔ ہار جیت اکثر اتفاق سے ہوتی ہے، لیکن ایرانیوں کی اس شکست میں بڑا بھید تھا، اور وہ یہ کہ یونانیوں نے اپنی زندگی کو ایسی شکل دی تھی اور اپنے حوصلوں کو ایسے سانچے میں ڈھالا تھا کہ تعداد اور مال و دولت میں بہت کم ہوتے ہوئے بھی وہ ایرانیوں کی سی طاقت پر غالب آ سکتے تھے۔ یونانی صحیح معنی میں آزاد تھے، اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے انھیں بڑی محبت تھی، اور ہر روشن خیال یونانی کا یہ حوصلہ تھا کہ وہ اپنی استعداد ریاست کی خدمت کر کے دکھائے۔ ایرانیوں کو جو آزادی تھی وہ شخصی تھی، سیاسی آزادی کا انھیں کوئی احساس نہیں تھا۔ ان کی ریاست اتنی بڑی تھی کہ ان کو

اس سے کوئی گہرا ذاتی لگاؤ ہو ہی نہیں سکتا تھا اور اپنی استعداد کا ثبوت دے کر بادشاہ کی نظروں میں عزت، اس کے دربار میں مرتبہ حاصل کرنے کے سوا ان کی ہمت بڑھانے کو اور کوئی جذبہ نہ تھا۔ ایران کی سلطنت یونان کی چھوٹی شہری ریاستوں سے زیادہ عرصہ تک قائم رہی، لیکن وہ ایرانیوں کو وطن پرست نہ بنا سکی، کیونکہ وہاں حکومت بادشاہ کی مرضی سے ہوتی تھی، بادشاہ کے منصوبوں سے رعایا کو ذرا بھی مطلب نہ ہوتا تھا، ایرانی فوج کے سپاہی پیشہ ور تھے، اپنے بادشاہ کے حکم سے اور خود نام پیدا کرنے کے لئے لڑتے تھے، اور ان کے دلوں میں قوم، وطن تہذیب کا درد نہ تھا۔ یونانی اپنی ریاستوں کا سارا کاروبار خود کرتے تھے، ان کے دلوں میں ہر خطرے کے وقت اپنے ذاتی نقصان سے بڑھ کر قوم، وطن، تہذیب کی آبرو کا خیال رہتا تھا، اور اسی وجہ سے وہ ایرانیوں سے زیادہ کامیاب سپاہی نکلے۔

یورپ کے مورخ ان لڑائیوں کو یورپ اور ایشیا کا پہلا مقابلہ سمجھتے ہیں اور یونانیوں کی فتح کو یورپ والوں کی آیندہ ترقی اور عظمت کا نیک شگون ٹھہراتے ہیں۔ لیکن یہ صرف ان کی خود پسندی اور ان کا گھمنڈ ہے، اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر یونانی ہار گئے ہوتے، تب بھی موجودہ زمانے کے یورپی مورخ اس واقعے کی ایسی تعبیر کرتے کہ سہرا یونانیوں، یعنی یورپ والوں کے سر

رہتا۔ یورپ اور ایشیا مغرب اور مشرق کا جو فرق ہے وہ وحشیانہ اور مہذب اعلیٰ اور ادنیٰ، غلط اور صحیح زندگی کا نہیں ہے، صرف حالات کا فرق ہے یورپ میں جو لوگ آباد ہوئے انھیں چھوٹے اور اکثر قدرتی طور پر تقسیم کئے ہوئے ملک ملے، ان کی زندگی کا پیمانہ اتنا چھوٹا تھا کہ وہ الگ الگ قومیں بن سکتے تھے، اور ہر قوم اپنے کاروبار کو اپنا جان کر سنبھال سکتی تھی۔ ملکوں کی تقسیم ایشیا میں بھی ہے، لیکن یہاں کا ہر ملک ایک براعظم ہے، اس کے تمام باشندوں میں اپنائیت کا احساس عموماً سیاسی اتحاد کی شکل اختیار نہیں کر سکا اور اس وجہ سے وہ ملک کے کاروبار کو نہ اپنا سمجھے اور نہ اس سے جتنی دلچسپی کہ چاہیے رکھ سکے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نئی نسلیں سب ایشیا میں پیدا ہوئیں، اور سب نے جوان ہوتے اور زور پکڑتے ہی جنوب کے ملکوں پر جو تہذیب کے مرکز تھے دھاوا کیا۔ وہ لاکھوں کی تعداد میں لڑنے مرنے کے لئے آتی تھیں اور انھیں روکنے کے لئے ضروری تھا کہ دوسری طرف سے بھی لاکھوں مقابلے کے لئے آئیں، یعنی اگر ایشیا کے ملک چھوٹے ہوتے اور نئی نسلوں کا دھارا اسی زور کے ساتھ بہتا رہتا، تو یہ چھوٹی ریاستیں خود بخود بڑھ جاتیں، قوم کا خیال مٹ جاتا اور ویسی ہی بڑی ریاستیں قایم ہوتیں جیسی کہ ہمیں اپنی تاریخ میں ملتی ہیں۔

زندگی کا پیمانہ ایک طرف چھوٹا اور دوسری طرف بڑا ہونے سے لوگوں کی طبیعتوں پر بھی بہت گہرا اثر پڑا۔ یورپ کے وہ عالم جو مشرق والوں کے ہمدرد بنتے ہیں اس فرق کو اس طرح سمجھاتے ہیں، کہ مشرق میں لوگوں کا میلان روحانیت کی طرف ہے اور مغرب میں دنیا کی طرف ایک کو فلسفے اور مذہب میں ڈوبے رہنے کا شوق ہے، ایک کو دنیاوی زندگی کی اصلاح اور ترقی کا حوصلہ ہے۔ لیکن یہ مشرق والوں کی دلجوئی کا ایک طریقہ یا خالی ایک ڈھکوسلا ہے، کیونکہ ہم کو اگر بہت بڑے پیمانے پر زندگی کا انتظام کرنا پڑا اور ہم سینکڑوں برس انتظام کرتے رہے، مگر اس ڈھنگ سے نہیں جیسے کہ یورپ میں ہوا ہے اس لئے کہ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ ممکن ہی نہ تھا، تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہم میں انتظام کرنے کی قابلیت نہیں۔ نوع انسانی کو جتنے ہادیوں اور پیغمبروں نے مذہب کی صورت میں حق کا پیغام پہنچایا وہ سب ایشیا کے رہنے والے تھے، لیکن اس بات کو کہ جس پر یورپ والوں کو رشک کرنا چاہیئے وہ ایک کلنک کا ٹیکا بنا کر دکھاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی رشتہ چھوٹی جماعتوں کو متحد رکھ سکتا ہے، جب وہ بڑھ جائیں تو ان میں سوا مذہب اور اخلاق کے ربط قائم رکھنے کی اور کوئی صورت ہو نہیں سکتی۔ ایشیا میں جمہوری حکومت نہیں تھی، اس لئے کہ ان حالات میں جمہوری حکومت کام کو

سنبھال نہیں سکتی تھی۔ ایشیا میں وطن پرستی نہیں تھی، کیونکہ ایشیا کے ملک بڑے ہیں اور وطن کا تصور تنگ ہے۔

لیکن مشرق اور مغرب والوں کی طبیعتوں اور رجحانات کے اختلاف سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔ مشرق میں چھوٹی باتیں لوگوں کی نظروں میں نہیں جچتیں، یہاں تو ایسا نظام، ایسے اصول، ایسے عقیدوں کا سہارا چاہیئے جن میں مشرق کی سی بے پایاں، بیکراں زندگی پوری پوری سما سکے، اور لوگوں میں سہارے کی تمنا اتنی شدید ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے اصول اور عقیدے دل میں لے کر بیٹھ رہیں، اور اپنی دنیا اور اپنی زندگی سے غافل ہو جائیں۔ دوسری طرف یعنی مغرب میں اصول اور عقیدے کی کوئی خاص قدر نہیں رہی ہے، چھوٹی سی چیز کو ذرا سا ٹھکانا چاہیئے، اور مغرب والوں کا یہ ٹھکانا ان کی حکمت عملی اور مصلحت تھی۔ یہ طریقہ ہے تو بہت کارآمد کہ خرابی دیکھو تو اُسے دور کرو، ضرورت دیکھو تو اسے پورا کرو، اور خیالی باتوں میں مت پڑو، لیکن وہ مسافر بھی جو اپنی نظر سامنے ہی کی زمین پر جمائے رہے رستہ بھول سکتا ہے، کہ صحیح سمت کا پتہ لگانے کے لئے دور کی چیزوں کو، آسمان کو اور اس کے چاند تاروں کو بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس طرح مشرق اور مغرب دونوں میں لوگوں نے انتہاپسندی سے نقصان اٹھایا ہے، لیکن دنیا کے دونوں حصوں

میں میانہ روی اور اعتدال کو پسند کرنے والے بھی ہوئے ہیں۔ اس لئے میں
اگر دنیا کی کہانی کو مشرق اور مغرب کی تاریخ میں تقسیم کر دوں تو آپ بس یہ سمجھئے گا
کہ ہماری زندگی ایک بڑا سمندر ہے جس میں کبھی ایک طرف لہریں زیادہ
اٹھتی ہیں کبھی دوسری طرف، موجوں کو ابھارنے والی طاقت ایک ہے،
ان کی تڑپنے اور اچھلنے کی امنگ ایک۔

(۴)

یونانی تہذیب

آریوں کے آنے کے بعد دنیا کی کہانی جس طرح مشرق اور مغرب کی تاریخ میں تقسیم کی جاسکتی ہے اس کا ذکر آچکا ہے، اور میں یہ بھی بیان کرچکا ہوں کہ آجکل مغربی قوموں کی جو چال ڈھال ہے اس کا پہلا نمونہ یونان کی تہذیب ہے۔ اب یونانیوں کی کہانی سن لیجئے، جو ہماری بڑی کہانی کا ایک بہت چھوٹا سا مگر نہایت ہی دلفریب اور سبق آموز ٹکڑا ہے۔ دنیا میں آدمی نے کیا نہیں کر دکھایا ہے، پر اتنے تھوڑے آدمیوں کے اتنی ذرا سی مدت میں علم اور ادب اور فن میں ایسا کمال حاصل کرنے اور ایسی قیمتی اور حسین یادگاریں چھوڑنے کی مثال ہمیں اور کہیں نہیں ملتی۔

یونانی جس دنیا میں گھومتے گھامتے پہنچے اس پر ایک مہذب تاجروں کی نسل کا راج تھا جسے دولت پیدا کرنے اور پھر آسائش سے بڑے اور محفوظ شہروں میں زندگی بسر کرنے کا حوصلہ تھا، جس نے مال اور مسافروں کو لے جانے کے لئے خاصے بڑے اور مضبوط جہاز بنائے تھے، صنعت کو بہت ترقی دی تھی، زمین کے اندر دھاتوں کا جو خزانہ دفن ہے اس کی کنجی حاصل کر لی تھی، علم سے اس کو وہی بے تعلقی تھی جو تاجروں کو ہوتی ہے، لیکن اپنے کاروبار کے لئے اس نے لکھنے کا ایک طریقہ نکال لیا تھا، اور اس طرح علم اور تعلیم کے بڑھنے کی بھی صورت پیدا کر دی تھی۔ لیکن اس میں تاجروں کی طرح کا حوصلہ تھا تو سپاہیوں کی ہمت نہیں تھی، حفاظت کے لئے اس کے بادشاہوں کے پاس جو فوجیں تھیں ان میں زیادہ تر غلام یا غیر قوموں کے بھرتی کئے ہوئے سپاہی تھے، اور ان مختلف قسم کی چیزوں میں جس کی وہ تجارت کرتی تھی ایک قسم کا مال وحشی نسلوں کے نوجوان ہوتے تھے جنھیں سوداگر ادھر ادھر سے پکڑ لاتے اور اپنی منڈیوں میں بیچتے تھے۔ غالباً اسی سبب سے یونانیوں کی اس قدیم نسل کے لوگوں سے لڑائیاں ہوئیں۔ پہلے وہ ان مالدار بدیسیوں کا ظلم سہتے رہے، جب ان کے قدم ملک میں جم گئے اور ان کی قوت بڑھی تو انھوں نے پورا پورا بدلہ لیا، ٹروئی کا شہر، جو ایک پرانا اور نہایت شاندار تہذیب و تجارت

کا مرکز تھا چھ دفعہ جلا کر خاک کر دیا گیا، یہاں تک کہ زمین کی دیوی نے اسے اپنے آنچل میں چھپا لیا۔ کریٹ کا مشہور شہر کنوسوس بھی اسی طرح قریب ۱۰۰۰ ق م کے ایسا ویران کیا گیا کہ پھر کبھی آبادی نہ ہوا۔

اب یونانی اپنی دنیا میں اکیلے رہ گئے تھے، انھوں نے اپنے ملک کی چھوٹی چھوٹی وادیوں میں شہر بنائے، ان کی گذر بسر کا سب سے بڑا ذریعہ تو کھیتی باڑی تھی، مگر انھوں نے تجارتی کاروبار بھی پھیلایا اور پرانی بستیوں کو ویران کرنے سے جو تہذیبی نقصان ہوا تھا اسے پورا کرنے لگے۔ ان کے خاص مرکز ایتھنز اور اسپارٹا کے شہر تھے، مگر ان کے علاوہ یونان میں اور کئی شہر تھے۔ انھوں نے کئی جزیروں کو آباد کیا تھا اور ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر ان کے تین چار بڑے تہذیبی مرکز تھے۔ ان کے دل میں خدا جانے کیسے یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ہر شہر کو ایک الگ ریاست ہونا چاہیے وہ کبھی متحد نہیں ہو سکے، اور جب چھٹی صدی قبل مسیح میں ایران کی سلطنت ایشیائے کوچک کے مغربی سرے تک بڑھ آئی تو یہاں کی شہری ریاستیں اس کے سامنے سر نیچا کرنے پر مجبور ہوئیں۔ پھر بھی ایرانیوں نے سمندر پار کر کے ایتھنز پر حملہ کیا تو یونانیوں نے انھیں چار پانچ تاریخی لڑائیوں میں شکست دی اور ان کی آزادانہ زندگی اس کٹھن آزمائش میں پوری اتری۔ اسی وقت سے

یونانی تہذیب کے بہار کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔

علم کا چرچا سب سے پہلے ان یونانیوں میں ہوا جو ایشیائے کوچک کے شہروں میں رہتے تھے، یا جنھیں مصر، شام اور بابل کے لوگوں کی معلومات سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا، لیکن ایرانیوں سے جو لڑائیاں ہوئیں ان کے بعد ایتھنز کا شہر ہر قسم کے علم اور فن کا مرکز بن گیا، یونان کی آبرو یہی شہر تھا اور اس کی نمایاں سیاسی، علمی اور ادبی شخصیتوں پر ہم ایک نظر ڈال لیں تو سمجھیے یونان میں جو کچھ دیکھنے کے قابل تھا وہ ہم دیکھ لیں گے۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، یونانی محنت مشقت کے سارے کام غلاموں سے لیتے اور آپ بحث مباحثے، سیر تماشے یا حکومت کے کاموں میں لگے رہتے۔ لیکن خود یونانیوں میں امیر غریب کا فرق تھا، اور کبھی کبھی یہ فرق اتنا بڑھ گیا کہ خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں اور زندگی میں بہت ابتری پڑ گئی۔ ایتھنز والے اس معاملے میں خاص طور پر خوش قسمت تھے کہ انھیں شروع ہی میں سولن جیسا تجربہ کار اور موقع شناس مدبر مل گیا جس نے ایتھنز کے تھوڑے سے امیر اور بہت سے غریب باشندوں میں حقوق اور اختیارات اس طرح تقسیم کیے کہ امیر عزت اور شہرت حاصل کر سکیں، مگر غریبوں پر ظلم نہ ہو وہ ذریعہ معاش سے محروم نہ کیے جا سکیں اور ان کے لئے حکومت میں حصہ

لینے کا موقع رہے۔ یونان کے اور شہروں میں ایسا نہیں کیا گیا، وہاں غریبوں اور امیروں کو ایک دوسرے پر کبھی پورا اعتبار نہیں ہوا، اور اس لئے ان میں ہمیں وہ آزادی اور شگفتگی نہیں نظر آتی جو ایتھنز کے درو دیوار سے ٹپکتی تھی

ایرانیوں سے جو دوسری جنگ ہوئی اس میں ایتھنز کا شہر جلا دیا گیا اور جب ایرانیوں کی بلا ٹل گئی تو وہ نئے سرے سے آباد کیا گیا۔ اس وقت ایتھنز کی حکومت پر پرکلیس کا سایہ تھا، جو سیاست کے فن میں کامل تھا، فنون لطیفہ میں نہایت نفیس مذاق رکھتا تھا، ہنر پہچاننے اور آدمی کا جوہر پرکھنے میں ماہر تھا اور زندگی کے باغ کو سرسبز اور شاداب رکھنے کے بھید جانتا تھا۔ اس نے ایتھنز میں عالی شان عمارتیں بنوائیں، شہر کو حسین مورتوں سے آراستہ کیا عالموں اور ادیبوں کی سرپرستی کر کے تہذیب کی اعلیٰ دلچسپیوں کا چرچا کیا، اور اعتدال پسندی اور میانہ روی کی نازک لڑی میں آزادی اور استحکام، شائستگی اور مردانگی، فراغت، اور کام کاج، ہنسی مذاق کا لطف اور سنجیدگی کو موتیوں کی طرح پرو دیا۔ جیسا کہ ایک مشہور عالم نے کہا ہے "تیس برس تک ایتھنز کی صورت پرکلیس کی صورت تھی" اور اس کی طبیعت کا حسن ایتھنز کی زندگی میں سمایا رہا۔ لیکن ایتھنز والوں نے اس کا دل سے احسان نہ مانا، اس کی تیس برس کی حکومت سے، اگرچہ ہر بات ان کی رضامندی سے ہوتی تھی،

اس کی جادوبھری زبان اور اس کی مصلحت اندیشی سے وہ عاجز آ گئے۔ ان کی فطرت ایسی تھی کہ وہ ہر روز ایک نیا ہنگامہ چاہتے تھے۔ ان کی آنکھیں ہر روز ایک نیا تماشا دیکھنا اور ان کی زبانیں کسی نت نئے مسئلے پر گفتگو کرنے کا مزہ چکھنا چاہتی تھیں۔

یہ پچھن سب ایسے تھے جو انھیں کسی ایک ڈھرے پر چلتے رہنے سے روکتے تھے، اور ان سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ یونانیوں کا کوئی مذہب نہ تھا۔ وہ اپنے آبا و اجداد کی اتنی عزت کرتے تھے کہ اسے ہم پرستش کہہ سکتے ہیں، ہر قبیلے اور ہر شہر کا ایک محافظ دیوتا یا دیوی ہوتی تھی، جیسے ایتھنز کی پالاس اتھینے تھی، لیکن ان دیوتاؤں کو وہ آدمیوں سے کچھ ہی بہتر اور زیادہ طاقتور مانتے تھے، اور یہ دیوتا تھے بھی ایسے کہ ان کے منہ سے کبھی بھولے سے بھی ایک حرف نصیحت یا ہدایت کا نہ نکلا۔ ایتھنز والوں کو جو اخلاقی تعلیم دی گئی وہ ڈلفی کے مشہور مندر کے پجاریوں، ان کے اپنے رشی سولن یا پھر شروع کے چند فلسفیوں نے دی، اور تینوں نے یہی بتایا کہ اعتدال اور میانہ روی زندگی کا سب سے اچھا اصول ہے، اس میں سلامتی بھی ہے اور کامیابی کا راز بھی۔ سارے یونانی نہیں تو ایتھنز والے ضرور طبیعت سے بھی کچھ اسی طرف مائل تھے اور ان تمام اثرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعتدال اور میانہ روی ان کی زندگی کا معیار بن گئی۔ اس کی

ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ ایک ورزشی مقابلے میں کوئی شخص آیا جس نے گھڑیوں ایک پیر پر کھڑے رہنے کی مشق کی تھی۔ ایتھنز والوں نے اس کا بہت مذاق اُڑایا اور کہا کہ اس فن میں تو ہمارے یہاں کی ہر بطخ تمہیں مات کر دے گی، جاؤ یہ کرتب کہیں اور دکھاؤ۔

یونانی آزادی کو بھی دل سے چاہتے تھے، ہر چیز جو آدمی کو کسی طرح سے بھی پابند کرتی ہے، دولت، ٹھاٹھ باٹ، گھریلو زندگی، آرام کی عادت، کھانے پینے اور پہننے کا شوق، سب کے پھندے سے وہ بچنا چاہتے تھے۔ ان کی غذا میں، لباس رہن سہن میں، ہمیشہ وہ سادگی رہی جو ان کے مزاج میں تھی، اور ان کے علم اور فن کی طرح یہ بھی ان کی ایک بڑی قیمتی یادگار ہے لیکن زندگی کا سارا بوجھ سنبھالنے کے لئے میانہ روی اور سادگی کے دو اصول کافی نہیں ہیں، اور اگرچہ ایتھنز والے ان دونوں اصولوں کو اپنا مذہب مانتے تھے، ان کا روز مرّہ کا معمول ایسا تھا کہ بھٹک جانا کچھ مشکل نہ تھا۔

یونانیوں کو میل ملاقات اور بحث مباحثے کا بیحد شوق تھا، گھر کے انتظام میں جو ذرا سا وقت لگتا اس کے علاوہ سب اسی شوق کو پورا کرنے میں صرف ہوتا، اور اسی سلسلے میں وہ اپنی سیاسی خدمات بھی انجام دیتے تھے

ایتھنز کی قانون بنانے والی مجلس میں، حکومت کی کمیٹی میں اور عدالتوں میں قریب ایک ہزار آدمی ایک وقت میں کام کرتے تھے، اور ان سب کو کام کرنے کا معاوضہ ملتا تھا، تاکہ جو غریب ہوں وہ نقصان کے خیال سے سیاسی کاروبار سے الگ نہ رہیں۔ مجلس اور کمیٹی اور عدالتوں کے اجلاس سر بازار ہوتے تھے، اور جو لوگ خود کام نہ کرتے وہ تماشائی بن کر بیٹھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ آئے دن تہوار ہوتے، یا ڈرامے دکھائے جاتے، جن کی حیثیت تہواروں سے کم نہ تھی، اس لئے کہ تمام شہری انھیں جا کر دیکھ سکتے تھے۔ ایسی فضا میں کیسے ممکن تھا کہ یونانیوں جیسی ذہین اور جدت پسند قوم کسی ایک ڈھرے پر چلتی رہتی، جب علم کا ذرا چرچا ہوا تو ہر قسم کے اوچھے مگر ایک حد تک صحیح خیالات سکوں کی طرح لئے دیئے جانے لگے، کسی کا عقیدہ یہ تھا کہ اصل چیز کامیابی ہے، جو کامیاب ہو اس کی حرکتوں کی جانچ پڑتال نہیں کی جاتی، کوئی کہتا تھا کہ انصاف ایک ڈھکوسلا ہے، جس کی قوت زیادہ ہو اسی کی مرضی کو قانون اور انصاف کہتے ہیں، کوئی سمجھتا تھا کہ زندگی کا مزہ اسی کو ملتا ہے جو بغیر روک ٹوک کے من مانی بات کر سکے۔ یہ اور ایسے بہت سے خیالات اکثر گفتگو میں چاشنی پیدا کرنے کے کام آتے تھے مگر ان کا چرچا ہونا ہی اس کی علامت تھی کہ یونانی کسی بات کو سچ مچ مانتے

نہیں تھے۔

پھر ان میں ایک شخص پیدا ہوا جس نے ثابت کر دیا کہ وہ کچھ جانتے بھی نہیں تھے۔ یہ ایتھنز کا مشہور فلسفی سقراط تھا (۴۶۹ - ۳۹۹ ق م)۔ وہ لوگوں کو اتنا قابل بنتے دیکھ کر خود نادان بن گیا اور لوگوں سے بحث چھیڑ کر ہمیشہ یہ ثابت کر دیا کہ ان کے خیالات سب غلط ہیں اور وہ بغیر سوچے سمجھے ان پر گفتگو کرتے ہیں۔ خود اس نے اپنا کوئی عقیدہ بیان نہیں کیا، لیکن اس کے ایک شاگرد افلاطون نے یہ کمی پوری کر دی۔ افلاطون نے اپنی ساری تعلیم سقراط کی زبانی بیان کی ہے، مگر ہم جانتے ہیں کہ اس کا فلسفہ اپنا تھا۔ سقراط کی طرح اسے بھی اس بات سے بڑا دکھ ہوا کہ ایتھنز والوں کے خیالات میں کوئی گہرائی نہیں تھی، وہ بھی سمجھتا تھا کہ اچھے خیالات پر کسی قوم کا گذر نہیں ہو سکتا، مگر سقراط کی طرح جاہل بننے کے بجائے اس نے یونانیوں کے دل و دماغ کو علم اور فلسفے اور عقیدے سے روشن کرنا چاہا۔ ایتھنز والوں کی گمراہی دیکھ کر اس نے ایک ریاست کی تصویر کھینچی جو اسے یقین تھا کہ ایتھنز کی جمہوری ریاست سے زیادہ پائدار ہوگی، اور اخلاقی حوصلوں میں جان ڈالنے کے لئے اس نے یہ تعلیم دی کہ اصل حقیقت، جس پر علم، اخلاق اور لطیف جذبات کا دارومدار ہے کامل علم، کامل خیر اور کامل

حسن کا تصور ہے۔ ہماری زندگی کا مقصد یہ ہے کہ ہم اس قدیم اور لازوال نمونے کی مثال بنیں، اور ہماری فلاح اور نجات اسی میں ہے کہ ہم اس مقصد کو حاصل کرنے میں اپنی ساری جسمانی اور اخلاقی قوت کھپا دیں۔

افلاطون نے اپنی ایک تعلیم گاہ بھی قائم کی جو اس کی اکادمی کے نام سے مشہور ہے، اور اس کے لئے جو نصاب اس نے بنایا وہ سینکڑوں برس رائج رہا۔ اسی اکادمی کا ایک طالب علم ارسطو تھا جس نے علم کو منطق اور فلسفے سے ایک حد تک الگ کر کے اس کی بنیاد معلومات پر رکھی، اور عالم کا فرض تحقیق کرنا اور معلومات اکٹھا کرنا ٹھہرایا، یعنی اس نے وہ طریقہ شروع کیا جو آجکل یورپی علم کا ہے، اور جیسے افلاطون فلسفے کا ویسے ہی ارسطو علم کا بانی مانا جاتا ہے۔ افلاطون نے ایتھنز والوں کی ہدایت کے لئے سیاسیات پر جو کتاب لکھی اس میں اس پر بحث کی ہے کہ عدل اور انصاف کیا ہے، اور ریاست کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ عدل کی ایک مجسم صورت ہے۔ ارسطو کا خیال تھا کہ سیاسی معاملات پر رائے دینے سے پہلے ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اب تک جو تجربہ ہوا ہے وہ ہمیں کیا سکھاتا ہے، اور اس نے اپنی کتاب میں بہت سی ریاستوں کے دستور پر بحث کی ہے۔ افلاطون شاعری، مصوری، ڈراما غرض تمام فنون لطیفہ کو انسان کے لئے مضر سمجھتا تھا، اور انھیں تعلیم اور زندگی سے

خارج کر دینا چاہتا تھا ارسطو نے کہا کہ نہیں، یہ طریقہ ٹھیک نہیں، ہمیں ان پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔ اور اس سلسلے میں اس نے ادبی تنقید پر سب سے پہلی کتاب لکھی۔ افلاطون کا عقیدہ تھا کہ تمام علم چشمے ہیں جو علم کامل کے پوشیدہ سرچشمے نکلے ہیں، یعنی ان کی اصل ایک ہے۔ ارسطو نے اپنے زمانے کے ہر علم کو ہر دوسرے علم سے علیحدہ کیا، اس کی حد بندی کر دی، اور اس حد کے اندر اسے بالکل آزاد کر دیا۔

اس وقت ہم چاہے جس علم کی تاریخ لکھنے بیٹھیں، سب سے پہلے کسی یونانی کا نام آتا ہے، کہ جس نے اپنے زمانے کی معلومات کو جمع کر کے اور خود اس میں بہت کچھ جوڑ کر اسے ہمارے لئے چھوڑا۔ یونانیوں کا اتنا ہی بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے انسان کو اور انسانوں سے الگ کر کے دیکھا اور اس کی صورت، اس کی طبیعت اور اس کے دکھ سکھ کو سنگ تراشی، مصوری، شاعری اور ڈرامہ کا موضوع بنایا۔ یونانیوں کے زمانے تک اور اس کے بعد بھی اکثر فنون لطیفہ پر مذہب کا راج رہا، یونانیوں کا کوئی مذہب نہیں تھا کوئی ایسے عقیدے، زندگی کا کوئی ایسا تصور نہیں تھا کہ جس میں الگ الگ انسانوں کی ہستی گم ہو جائے۔ اور ان کی دنیا بھی اتنی چھوٹی تھی کہ وہ سب کو الگ الگ دیکھ بھی سکتے تھے، بلکہ یوں کہیے کہ ان کی دنیا میں انسان کے سوا

کچھ تھا ہی نہیں - پھر ان کی آزادی بھی غضب کی تھی، کہ وہ دوسرے کی کہی ہوئی بات ماننا نہ ماننا اپنا حق سمجھتے تھے، اور آدمی جو کچھ بھی کرتا اس پر ایک بالکل نرالے پہلو سے غور کر سکتے تھے - فن تعمیر، سنگ تراشی اور مصوری میں تو انھوں نے مصر، کریٹ اور دوسرے ملکوں کے استادوں سے بہت کچھ سیکھا، شاعری میں ان کا اپنا طرز تھا، اور ڈراما تو انھیں کی ایجاد ہے - ان سب میں جس چیز پر ہماری نظر پڑتی ہے اور ایک دفعہ پڑنے کے بعد پھر ہٹتی نہیں وہ انسان ہے۔ یونان کے سنگ تراشوں نے آدمی کا حسن جیسے دکھایا وہ اب تک کامل حسن کا نمونہ مانا جاتا ہے، ایک ایسا نمونہ کہ جسے قدرت اور انسان نے مل کر بنایا اور پھر توڑ ڈالا کہ نااہل اس کی نقل نہ کر سکیں - انسان کی طبیعت کے جو بھید یونانیوں نے پائے، جو کیفیتیں انھوں نے اپنے ڈراموں میں بیان کیں ان کے آگے ہمیں نہ تجربہ لے جا سکا ہے اور نہ تخیل، ہماری زندگی بدل گئی ہے، ہمارے تھیٹر کا انتظام، منظر دکھانے کے طریقے اور ایکٹروں اور ایکٹریسوں کا بناؤ سنگار بہتر ہے، لیکن اگر ہم آدمی کو اسی طرح صاف صاف دکھا سکیں جیسے کہ یونانی دکھاتے تھے تو یہ ایک کارنامہ ہو جاتا ہے۔

لیکن یونانیوں کے گن کب تک گائے جائیں ان کے کرشموں کی داستان تو ایک دنیا کی کہانی ہے۔

(۵)

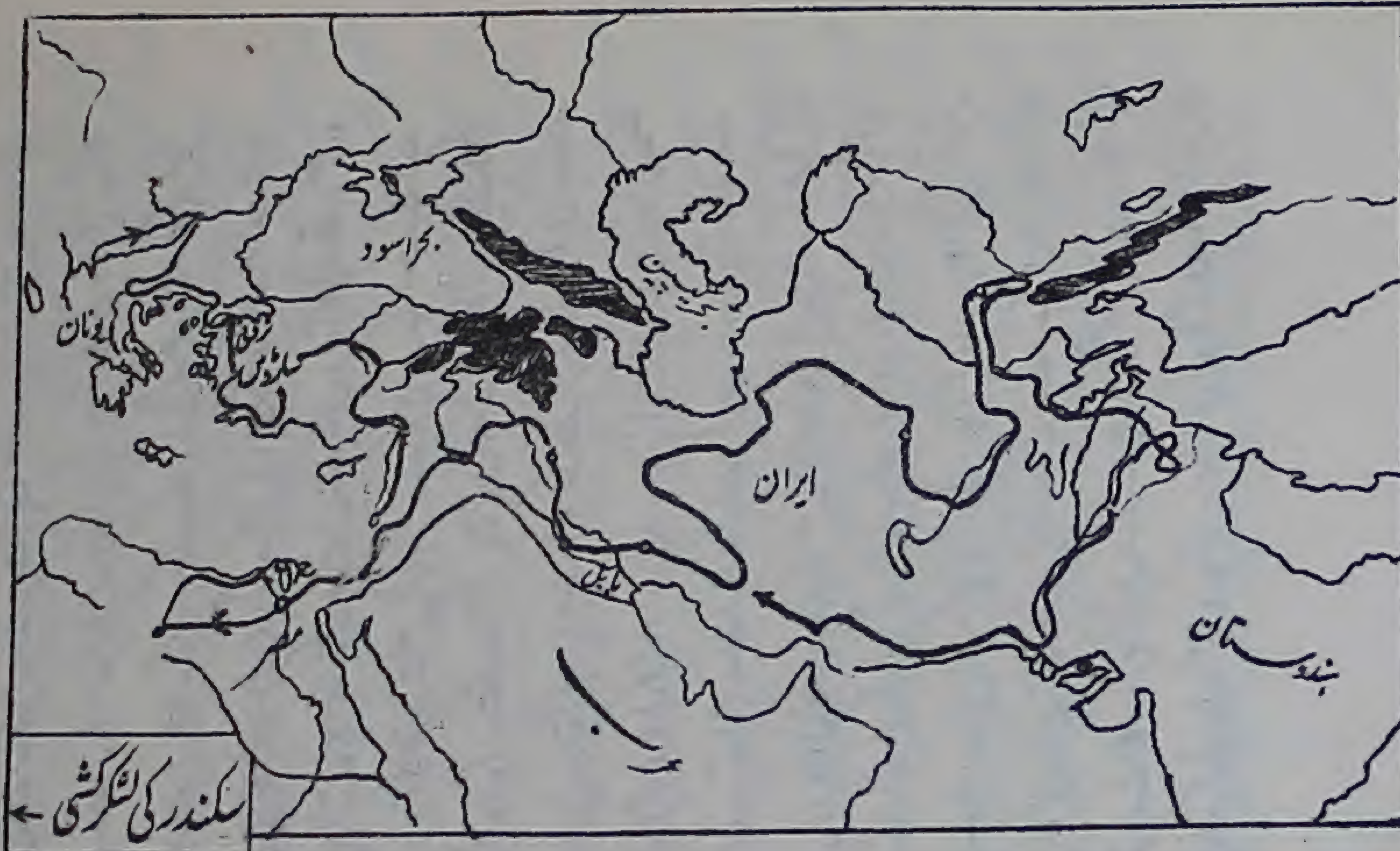
یونان اور روم

یونانی تہذیب کا ستارہ ہمارے آسمان پر بس دم بھر کے لیے چمکا اور اس کی روشنی میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ ہماری زندگی میں اس کا اجالا اب تک باقی ہے۔ افسوس ہے خود یونانیوں کے لئے چراغ تلے اندھیرے کی صورت تھی اور وہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے رہے۔ کچھ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے اوصاف کی قدر نہ کرتے ہوں۔ ان کے مشہور سیاسی اور تہذیبی رہنما پرکلیس نے ایک تقریر میں اپنے شہر والوں کی تمام خوبیاں گنائی تھیں۔ "ہم حسن پرست ہیں مگر اعتدال کے ساتھ، اس دانائی کے قدر دان ہیں جس سے مردانگی میں فرق نہ آئے۔ دولت ہمارے لئے خالی دکھاوے کا سامان نہیں بلکہ اعلیٰ مقاصد کا ذریعہ

ہے . . . ہمارے شہری ذاتی اور قومی فرائض یکساں انجام دیتے ہیں اور گھر گرستی کے کاموں میں ایسے ڈوب نہیں جاتے کہ شہر کے معاملات سے غافل ہو جائیں۔ عمل میں ہم سے زیادہ منچلا کوئی نہیں، لیکن عمل سے پہلے ہم سے زیادہ کوئی سوچ بچار بھی نہیں کرتا۔ نوع انسانی میں بس ہم ہی ایسے ہیں جو اپنے فائدے کے خیال سے نہیں بلکہ آزادی پر دلیرانہ بھروسا کر کے غیروں پر احسانات کرتے ہیں۔" اسی تقریر میں پرکلیس کہہ چکا تھا کہ "ہمارا دستور جمہوری کہلاتا ہے اس لئے کہ حکومت چند آدمیوں کے ہاتھ میں نہیں، پوری جماعت کے ہاتھ میں ہے . . . ہم سیاسی زندگی میں ہر ایک کو اپنا جوہر دکھلانے کا موقع دیتے ہیں، اور یہی اصول ہم اپنی روزمرہ زندگی میں برتتے ہیں۔" بے شک یونانیوں اور خاص طور پر ایتھنز والوں کے پاس جوانمردی اور ایثار کے بہتر سے بہتر نمونے موجود تھے، اور پرکلیس کی طرح وہ بھی مانتے تھے کہ "ساری دنیا اعلیٰ شخصیتوں کی یادگار ہے۔ ان کی داستان وطن میں ان کے سنگ مزار ہی پر کندہ نہیں ہے بلکہ دیر تک اور دور تک بغیر کسی ظاہری علامت کے لوگوں کی زندگی میں سمائی ہوئی اور بسی ہوئی رہتی ہے۔" لیکن پرکلیس کا دل جانتا ہو گا کہ ایتھنز کے شہریوں کا جو نقشہ اس نے کھینچا وہ ایک مثال، ایک معیار تھا، اصل میں ایتھنز والے عام طور سے اگر ذہین اور منچلے تھے تو چھچھورے، حاسد اور فسادی

بھی تھے، اور ان میں جو بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں وہ سپاٹ میدانوں کے ٹیلوں کی طرح تھیں، کہ جن پر چڑھ کر آدمی دور تک دیکھ سکتا ہے مگر جن سے موسم اور فضا پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہی وجہ تھی کہ یونانی کبھی متحد نہ ہو سکے، ان کا سیاسی نظام بہت کمزور رہا اور ان کی آزادی بہت جلد چھن گئی۔

خود ان میں جو لوگ ذرا دور اندیش تھے وہ جانتے تھے کہ ایسی زندگی کا جیسی کہ ان کی تھی کوئی اعتبار نہیں، اور آخر میں شمالی یونان کے ایک بادشاہ فلپ نے، صرف اس لئے کہ وہ یونانیوں کو تباہی سے بچانا اور ان کی تہذیب سے دنیا کو فیض پہنچانا چاہتا تھا، یونان کی آزاد شہری ریاستوں کو اپنے ماتحت کر لیا (۳۳۸ ق م)۔ فلپ نے یونانی تہذیب کو پھیلانے کا حوصلہ اپنے لڑکے سکندر اعظم کے دل میں بھی ڈالا، اور یہ خدمت انجام بھی دی گئی، اگرچہ اس طرح سے نہیں جیسے کہ فلپ یا دوسرے روشن خیال یونانی چاہتے تھے۔ سکندر نے یونان کے شہر تھیبس کو برباد کر کے (۳۳۶ ق م) یونانیوں کو سہما دیا، کہ اس کی عدم موجودگی میں وہ کوئی فساد نہ کریں، اور پھر اس فوج کو لے کر جسے اس کے باپ نے تیار کیا تھا، دنیا فتح کرنے کو نکل پڑا۔ ایشیائے کوچک کے مغربی اور جنوبی ساحل کا چکر لگا کر وہ اسس Issus پہنچا، جہاں اس نے ایرانیوں کو پہلی بار شکست دی، اور پھر شام اور فلسطین ہوتا ہوا مصر



سکندر کی لشکر کشی ←

گیا۔ مصریوں کے ساتھ اس نے بہت اچھا سلوک کیا، اور یہیں ایک مندر کے پجاری نے اس کو اس خبط میں مبتلا کر دیا کہ وہ آدمی کی اولاد نہیں، کسی دیوتا کا لڑکا ہے۔ اس خبط نے سکندر کے دماغ کو، جو پہلے سے کچھ پھرا ہوا تھا، اور بھی بگاڑ دیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت تک سکندر جیسا سپہ سالار پیدا نہیں ہوا تھا، لیکن یونانیوں کے یہاں دیوتا کافی تھے، انھیں ایک نئے دیوتا کی ضرورت نہیں تھی بلکہ سپہ گری اور سیاست کے ایسے ماہر کی جو دشمنوں کو رستے سے ہٹا کر یونانیوں کو مشرق کی طرف پھیلنے کا موقع دے، اور ان پر یہ جتا کر کہ دنیا بہت بڑی جگہ ہے ان کی تنگ نظری دور کرے۔ سکندر نے اپنی فوجوں کو آباد اور مہذب دنیا کی سیر کرا دی، یونانیوں کے لئے خشکی اور سمندر کے تمام رستے صاف کر دئے، مگر سورما اور دیوتا بننے کے شوق میں وہ یونانی تہذیب ہی کو نہیں بلکہ معمولی انسانیت تک کو بھول گیا۔ کامیابی کے ساتھ اس کی عیاشی، شراب خواری اور دیوانہ پن بڑھتا گیا، اور جب وہ ۳۲۳ ق م میں مر گیا تو مشرقی دنیا ذلیل اور رسوا ہو چکی تھی مگر یونانیوں کا بھی دامن تر تھا اور سر نیچا۔ سکندر کے مرتے ہی اس کا سامراج بھی دم توڑنے لگا، اور یونانیوں کے لئے پھر ان کی شخصی ہمت اور حوصلوں کے سوا اور کوئی سہارا نہیں رہ گیا۔ یہ سہارا ابھی کچھ ٹوٹا ہی سا تھا، کہ ان کی

شہری ریاستیں بے آبرو ہو چکی تھیں، اور ان کی آپس کی عداوتیں ایسا روگ بن گئی تھیں کہ جس کا موت کے سوا کوئی علاج نہیں تھا۔

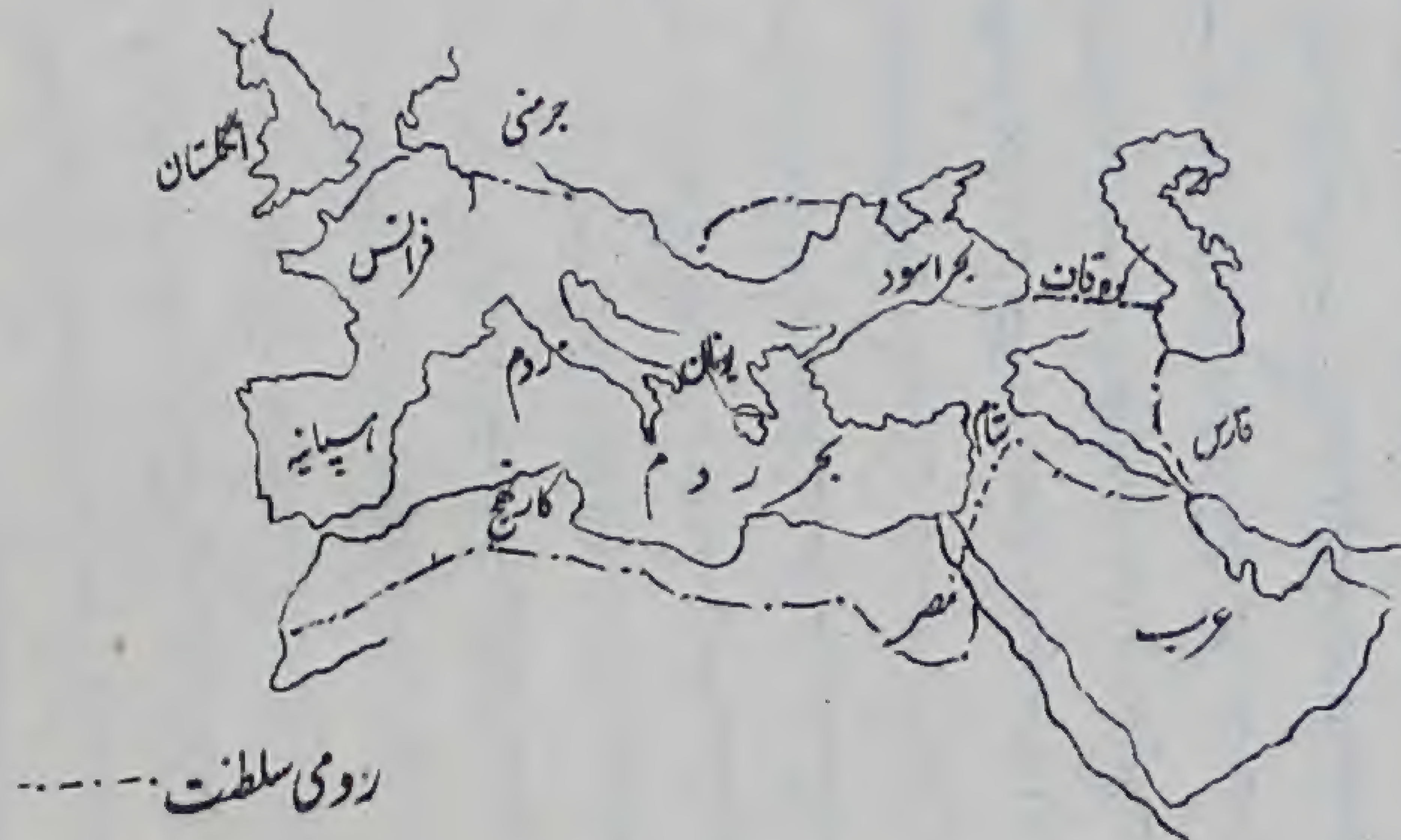
اصل میں تہذیب اور ملک گیری، ایمانداری اور دنیا داری کا ساتھ ہونا بڑی مشکل سے ہے۔ تہذیب پھیلانے کا دعویٰ وہ تمام قومیں کرتی ہیں جنھیں ملک گیری اور حکمرانی کا فن آتا ہے لیکن اس اندھیر میں جو ملک گیری ہمیشہ ڈھاتی ہے تہذیب کا چراغ بھلا کیا جل سکتا ہے، اور جلا بھی تو اس کی روشنی کتنوں کو رستہ سجھا سکتی ہے۔ ملک گیری کے تو معنی یہ ہیں کہ آدمی اس حد سے نکل جائیں جو تہذیب مقرر کرتی ہے، اور ان مقاصد کو جن کی قدر کرنا تہذیب ہمیں سکھاتی ہے بالائے طاق یعنی کسی اونچی، عزت کی جگہ پر رکھ کر ایسے حوصلوں کو ابھاریں جو آدمی کو دنیا میں کامیاب کرتے ہیں اور جو ضرورت ہو تو تہذیب کا بھیس بھی بنا سکتے ہیں۔ یونانی سکندر کے بل پر اپنی تہذیب نہیں پھیلا سکے، جو کچھ اس سلسلے میں ہوا وہ چھوٹے پیمانے اور شخصی طور پر کیا گیا، لیکن یہ ناکامیابی یونانی تہذیب کا قصور نہیں بلکہ اسکی نزاکت اور لطافت کی دلیل ہے اور اس کی روحانی اور اخلاقی قدر کو کم نہیں کرتی۔

یونانیوں میں سکندر اعظم کا کوئی وارث پیدا نہیں ہوا، اور اس دنیا پر

جسے یونانی اپنے سائے میں لینا چاہتے تھے سکندر کے کوئی ڈیڑھ دو سو برس بعد رومیوں کی قوم چھاگئی جو اس مغربی سمندر کی دوسری موج تھی۔ رومی قوم تہذیب سے بے بہرہ تھی، لیکن اپنے کاروبار کو ایسے ڈھنگ سے کرنا جانتی تھی کہ وہ ہر دم بڑھتا رہے، اپنی چیز بہت مضبوط پکڑتی تھی، مگر جب اور کسی طرح نہ بنتا تو اپنا حق محفوظ کرنے کی تدبیروں کو بٹوارے کی شکل بھی دے سکتی تھی۔ اپنی حکومت کو قائم رکھنے اور ہر طرح کے دیسی پردیسی مخالفوں کو پہلے ہی سے بدنام کر دینے کو اس نے Pax Romana امن رومی کا تصور قائم کیا جس نے لاکھوں آدمیوں کو اس دھوکے میں رکھا کہ مہذب، پرامن زندگی رومی قوم کے غلام بنے رہنے کے سوا اور کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتی۔ یونانیوں نے مہذب بننے کے شوق میں ہر نقصان گوارا کیا، اور دنیا میں اپنی ظاہری حیثیت بڑھانے کے سارے موقعے ہاتھ سے کھوئے۔ رومی جب اپنے زمانے کی ساری دنیا پر قبضہ کر چکے تھے تب کہیں جا کر انھیں احساس ہوا کہ تہذیب بھی ایک چیز ہے، اور اگر انھوں نے ملک گیری کے سلسلے میں یونان پر قبضہ نہ کیا ہوتا تو شاید انھیں اپنی خامیاں محسوس کرنا بھی نصیب نہ ہوتا۔

رومی سلطنت کی ابتدا روم کی شہری ریاست سے ہوئی، جس کی

بنیاد آٹھویں صدی ق م میں پڑی۔ شروع کے پانچ سو سال میں یہ یونان کی شہری ریاستوں سے کچھ مختلف نہ تھی، سوا اس کے کہ اس میں بڑھنے کا مادہ زیادہ تھا۔ روم کے شمال میں اٹلی کا ضلع ایٹروریا تھا، جو کریٹ اور کارتھج کی طرح فونیقی نسل کی تہذیب کا ایک مرکز تھا۔ سب سے پہلے روم نے اس تہذیب کو مٹایا اور ایٹروریا والوں کی تجارت اور دولت اپنے قبضے میں کی۔ پھر انھوں نے اتحادوں کے ذریعے اٹلی میں اپنا اثر بڑھایا، بحر روم کے مغربی حصے میں ان کا کاروبار پھیلا تو ان کا کارتھج سے مقابلہ ہوا، اور اسے بھی تین جنگوں کے بعد انھوں نے ۱۴۶ ق م میں جلا کر خاک کر دیا۔ اس عرصے میں اٹلی کا سارا ملک ان کے قبضے میں آ چکا تھا، اور شمالی یونان میں مقدونیا کی ریاست کو جس کا نام سکندر نے روشن کیا تھا تباہ کر کے انھوں نے یونان اور بلقان میں اپنا الو سیدھا کر لیا تھا۔ اس سلسلے میں وہ جو چالیں چلے وہ ان کی سیاسی حکمت کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ پہلے انھوں نے اس بیر کو جو یونانی مقدونیا کی ریاست سے رکھتے تھے آزادی اور خود مختاری کی ہوا دے کر بھڑکایا، انھیں اپنے ساتھ ملایا اور مقدونیا کی فوج کو شکست دی۔ پھر، یہ کہہ کر کہ دنیا میں کسی کو کسی پر ناجائز حکومت کرنے کا حق نہیں، اور ہر جگہ قانون اور انصاف کا راج ہونا چاہیے، انھوں نے یونان کی شہری ریاستوں سے ان کی آزادی


انگلستان
جرمنی
فرانس
اسپانیہ
روم
یونان
بحر اسود
کوہ قاف
فارس
شام
بحر روم
کارتھج
مصر
عرب
رومی سلطنت

چھین لی، اور کورنتھ کے شہر کو برباد بھی کر دیا، کہ غلط فہمی کا موقع نہ رہے۔ یونانیوں
کے مصر اور مغربی ایشیا سے تعلقات تھے، اور رومی مدبروں نے یہاں کی ریاستوں
کو بھی لڑائیوں میں الجھا کر ایشیائے کوچک، شام اور مصر کو اپنے ماتحت کر لیا۔

جس طرح رومیوں کو دوسروں کے جھگڑوں اور دشواریوں سے
فائدہ اٹھانے میں کمال تھا ویسے ہی وہ دوسروں کے علم اور تجربے سے
اپنے کام کی بات نکال لینا بھی جانتے تھے۔ یونان کی شہری ریاستوں کی طرح
روم میں بھی پہلے بادشاہوں کی حکومت تھی، پھر یہ بادشاہ چپکے سے علیحدہ
کر دیئے گئے اور حکومت شرفا کے ہاتھ میں آگئی، جنھوں نے مشورہ دینا ایک
مجلس کے سپرد کیا اور عملی اختیارات دو عہدہ داروں کو دیے جو کونسل
کہلاتے تھے اور ایک سال کے لئے چنے جاتے تھے۔ جیسے جیسے کام بڑھا
ان کونسلوں کے اختیارات مختلف عہدہ داروں میں تقسیم ہوتے گئے، اور
ان آزاد مگر غریب رومیوں کو جنھیں ریاست پر جان و مال قربان کرنے کی
ہر وقت نصیحت کی جاتی تھی، آہستہ آہستہ حکومت میں شریک ہونے
اور اس طرح اپنے حقوق کو محفوظ رکھنے کا موقع دیا گیا، مگر ویسے دل کھول کر
نہیں جیسے کہ ایتھنز میں سولن نے انھیں شریک کیا تھا۔ روم کی حکومت اصولاً
تو جمہوری تھی، اصل میں شرفا سیاہ و سپید کے مالک تھے، اور جب انھوں نے

ملک گیری پر کمر باندھی تو انھیں آزاد اور غریب لوگوں نے سب سے زیادہ نقصان اٹھایا۔ وہ فوج میں بھرتی ہوتے، برسوں لڑتے پھرتے، اور وطن واپس آتے تو معلوم ہوتا کہ ان کی زمین چھن گئی ہے، یا ایسا کوئی انقلاب ہو گیا ہے کہ ان کی زمین کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ پہلے تو یہ تھا کہ رومی ریاست اپنے شہریوں کے ساتھ خاص رعایت کرتی تھی، لیکن سنہ ۸۹ ق م میں اٹلی کے تمام باشندوں کو روم کے شہریوں کے حقوق مل گئے، جس سے اگر ایک طرف بہت سے لوگوں کی حیثیت بڑھ گئی تو دوسری طرف ان لوگوں کا کوئی سہارا نہیں رہا جن کی جاں بازی اور وطن پرستی کی بدولت روم نے ترقی کی تھی، کیونکہ ریاست نے ان کی بسر اوقات کا انتظام کرنا چھوڑ دیا۔ وہ تباہ ہو گئے، مگر شرفا کی خود غرضی نے جو حد سے گذر گئی تھی انھیں بھی ڈبو دیا۔ ملک گیری کے منصوبوں نے سپہ سالاروں کے اثر کو بہت بڑھا دیا، سپہ سالاروں میں رقابتیں پیدا ہوئیں، اور آخر میں پھر اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ کوئی شخص جمہوری حکومت کے تکلفات کو چھوڑ کر شہنشاہ کی حیثیت سے اور فوج کے بل پر حکومت کرے۔

رومیوں میں کام چلاتے رہنے کی ایسی خداداد قابلیت تھی کہ ہر چند ان کی ریاست کو شہنشاہوں کی ظلم اور زیادتی اور وحشی نسلوں کے حملوں کے

صدمے پہنچتے رہے، ان کی ریاست چار سو برس سے زیادہ قائم رہی اور ایسا نام چھوڑ گئی کہ لوگ اسے سینکڑوں برس بعد تک مصیبت کے وقت میں یاد کرتے رہے۔ رومیوں میں یہ صفت بھی تھی کہ وہ قاعدے قانون کو بہت مانتے تھے، اور یہ سمجھ کر کہ تجارت اور دولت کھنچ کر وہیں پہنچ جاتی ہے جہاں لوگوں کو جان اور مال کی سلامتی کا یقین ہو، انھوں نے روم میں پردیسیوں کے لئے ایک عدالت قائم کر لی جس میں رومی جج قوموں کے عام رواج یا اپنی عقل اور انصاف کے خیال کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔ انھیں فیصلوں سے آہستہ آہستہ ایک قانون تیار ہوا، جسے شہنشاہیت کے زمانے میں، جب یونانی فلسفے کا چرچا ہوا تو لوگوں نے قانون فطرت سمجھ لیا، اور اس طرح ایک اصطلاح رائج ہوئی جس نے بعد کو سیاسی دنیا میں بڑا ادھم مچایا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ قانون اس وقت کے تمام قانونوں سے بہتر تھا، اور یورپی تاریخ میں ہم دیکھیں گے کہ اس نے اصلاح میں بہت مدد دی۔ لیکن نہ تو یہ قانون رومیوں کی سیرت کو سدھار سکا اور نہ وہ فلسفہ جو بعد کو یونانیوں سے سیکھا گیا، اور اگر اخلاق اور انسانی ہمدردی کو دیکھا جائے تو رومی ان قوموں سے بدتر تھے جنھوں نے اس وقت تک تلوار کے زور سے بڑی سلطنتیں قائم کی تھیں۔ رومیوں کا مذہب کوئی تھا ہی نہیں، ان کی تہذیب بہت اوچھی تھی، وہ نہایت ہی بے رحم تھے

اور اپنے غلاموں کے ساتھ جو برتاؤ کرتے تھے، وہ ایشیا کی نسلیں جنھیں یورپی قوموں کے مورخ کبھی وحشی اور خونخوار کہنے سے نہیں چوکتے، اپنے کتوں کے ساتھ بھی نہ کرتیں۔ آدمیوں کو آدمیوں سے لڑانے، ان کا خون بہتے، اور ان کو تڑپ تڑپ کر جان دیتے دیکھنے میں روم کے سوا کہیں کے بھی لوگوں کو مزہ نہیں آیا۔ اور جب خون کی چاٹ پڑ گئی تو ہتھیار بندوں کی لڑائی سے رومیوں کو تسکین نہ ہوئی، اور وہ درندوں کے سامنے مرد، عورتیں بچے ڈالنے لگے۔ یہی وہ قوم تھی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے دنیا کو منظم سیاسی زندگی اور قانون کی عملداری کا سبق پڑھایا۔

روم کے زوال کے ساتھ مغربی قوموں کے عروج کا زمانہ جو قریب ایک ہزار سال تک تھا، ختم ہو گیا۔ اس سے پہلے دنیا کوئی ساڑھے چار ہزار برس تک مشرقی نسلوں کے قبضے میں رہ چکی تھی، یا آریوں کے اس حصے کے جس پر مشرق کے اثرات غالب تھے، اور اس کے بعد پھر کوئی ایک ہزار برس تک ان کا پلہ بھاری رہا۔ مغربی قوموں کے عروج سے یہ مطلب نہیں ہے کہ اس عرصے میں مشرقی دنیا سوئی ہوئی تھی، اور اس کی کوئی بات بیان کرنے کے قابل نہیں۔ اس عرصے میں چین کی سلطنت بہت بڑھی، ہندوستان میں موریا اور پھر اس کے بعد گپت سامراج قائم ہوا، اور درمیان کے زمانے

میں کشان سامراج جس نے مشرق کی تمام بڑی قوموں اور تہذیبوں کو ملایا،
اور ہر ملک کی زندگی کو ایک نیا رنگ دے دیا۔ لیکن اس عرصے میں ہم دیکھتے
ہیں کہ ایشیائے کوچک، عراق اور ایران کا خاصا حصہ مغربی قوموں کے پاس
تھا، تجارت اور تجارت کے بڑے رستوں پر انھیں کا قبضہ تھا، دولت
انھیں کے ہاتھ میں تھی، ان کے سکے ہمارے یہاں چلتے تھے، ہمارے ان کے
یہاں نہیں، اور انھیں باتوں سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ کس کی حیثیت
بڑھی ہوئی ہے۔

(۶)

قدیم چینی تہذیب

رومی سلطنت جب مشرق کی طرف بہت بڑھ آئی تو مشرق اور مغرب کے سرے مل گئے، کیونکہ اسی زمانے میں (۱۰۰ ق م - ۲۰۰ء) ہندوستان کے بدھ متی اپنے دین کا پرچار کرنے کو نکل پڑے تھے اور چین کے سپاہی ان میدانوں میں پہنچ گئے تھے جن پر سکندر اور رومی شہنشاہوں کی فوجیں کچھ حسرت اور کچھ خوف کی نظریں ڈال کر واپس ہوئی تھیں۔ وہ رستے جو سپہ سالاروں نے دریافت کئے تھے تاجروں کے کام آنے لگے اور انھیں رستوں پر تہذیب اپنے ساز و سامان کے ساتھ سفر کرنے لگی۔ یورپ اور مغربی ایشیا میں اس وقت تک جو کچھ کیا گیا اس پر ہم ایک سرسری نظر ڈال چکے



چین کا ایک پرانا مندر

ہیں، اب اس دولت کو بھی دیکھ لیجئے جو چین میں پیدا ہوئی اور جس نے ہماری دنیا کے تہذیبی سرمایہ کو بہت کچھ بڑھایا۔

چینی تہذیب کا پہلا دور اسی طرح صبح کے کہرے میں لپٹا ہوا ہے جیسے کہ اس زمانے میں اور جگہ کی زندگی۔ اتنا فرق ہم ضرور دیکھتے ہیں کہ مذہب کے معاملے میں چینیوں کی روش بالکل نرالی تھی۔ ان کی آبادی دو بڑے دریاؤں کے کناروں پر تھی، جن پر ان کی کھیتی باڑی کا دار و مدار تھا۔ لیکن یہ دریا، اور خصوصاً دریائے ہوانگ ہو، بڑا خطرناک تھا، کیونکہ وہ اچانک اپنا رخ بدل کر انھیں کھیتوں کو جنھیں وہ سیراب کرتا اکثر برباد بھی کر دیتا تھا۔ پھر بھی چینی اس دریا کو دریا ہی سمجھتے رہے، اس کا احسان مان کر یا اس کے غصے سے ڈر کر اسے دیوتا نہیں بنایا، بلکہ اسے قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ اپنے بادشاہ کو چینی آسمان یا خدا کا بیٹا مانتے تھے، مگر ایسا بیٹا نہیں کہ جس کا حق ہر حالت میں قایم رہے، اگر وہ ظلم کرتا یا بھٹک جاتا تو وہ یہ کہہ کر کہ بادشاہ سچ مچ خدا کا بیٹا نہیں ہوتا، بلکہ لے پالک ہوتا ہے اسے تخت سے اتار بھی دیتے۔ ان کا بادشاہ ان کا مذہبی سردار بھی ہوتا تھا، اور سال میں ایک دفعہ قربانی ہوتی تھی جب بادشاہ خدا کے بیٹے کی حیثیت سے صدر پجاری کے فرائض ادا کرتا۔ لیکن رعایا کے دین و ایمان میں اسے اور کسی طرح کا دخل نہیں تھا،

چینی سلطنت کا انتہائی عروج



اور چینی سماج میں ہمیں برہمنوں یا عیسائی پادریوں کا جواب بھی نہیں ملتا۔

پرانی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چین کے پہلے بادشاہ بڑے سورما تھے، جنھوں نے بستیوں کو ان وحشیوں سے محفوظ رکھا جو ان کے گرد منڈلاتے رہتے تھے، اور وہ ہوشیار انجینئر بھی تھے، کہ انھوں نے نہریں کاٹ کر اور بند باندھ کر دریائے ہوانگ ہو کے منہ میں لگام چڑھا دی۔ یہی شروع میں چین کے دو بڑے مسئلے تھے۔ لیکن جیسے جیسے آبادی بڑھی، چین کو منظم اور متحد رکھنے کا سوال زیادہ اہم ہوتا گیا۔ اسے حل کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی تھیں، ایک تو یہ کہ لوگوں کو ایسی تعلیم دی جاتی جو انھیں قاعدے قانون کا پابند رکھتی، دوسری یہ کہ حکومت کا انتظام بہت اچھا ہوتا، اور حاکم ان کاموں کی فکر لیتے جو رعایا پر نہیں چھوڑے جا سکتے۔ چین میں اس کی بھی کوشش کی گئی اور اس کی بھی، لیکن عام طور سے لوگوں کے دلوں میں تعلیم کی قدر بہت تھی، حکومت کی کم، دوسرے ملکوں میں علم اور تعلیم حکومت کی سرپرستی کی محتاج رہی، چین میں حکومت کی پرورش تعلیم کے سائے میں ہوئی۔ مورخ کے لئے چین کی کہانی شروع ہی اس وقت سے ہوتی ہے جب چھٹی صدی قبل مسیح میں دو بڑے عالموں اور فلسفیوں نے چینیوں کو منظم سیاسی اور اخلاقی زندگی کا سبق پڑھایا، جنوب میں لاؤ تسے اور شمال میں کونگ فوتسے نے۔

لاوٹسے کی تعلیم میں روحانیت زیادہ ہے، اور اگرچہ انھوں نے ایسے اصول بھی بتائے جو سماجی زندگی کو سدھارنے اور اسے ٹھیک ڈھرے پر لگانے میں بہت کام آسکتے تھے، ان کا اصل مقصد شاید یہ تھا کہ انسان کو زندگی بسر کرنے کے ایسے گر بتائیں جو اس کی فطرت کے مناسب ہوں، اس کی طبیعت کو آزاد چھوڑ دیں اور اسی آزادی سے ترقی کی امید رکھیں۔ وہ حکومت اور ان تمام طریقوں کے خلاف تھے جن کا دار و مدار زبردستی اور ظلم پر ہوتا ہے، وہ بس فطرت ہی کو صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کا معیار مانتے تھے، لیکن وہ فطرت کو سمجھتے بھی خوب تھے۔ دیکھیے، انھوں نے ایک جملے میں صحیح زندگی کی تعریف کی ہے، ور اس پر آپ جتنا بھی غور کریں گے اتنا ہی آپ کو یقین ہوتا جائے گا کہ آپ کی اپنی ذات اور اپنی سماج کیا ساری دنیا کو سدھارنے کی کوئی ایسی تدبیر نہیں ہے جس کی طرف اس میں اشارہ نہیں، اور لطف یہ ہے کہ اس میں زندگی کا ہر پہلو آجاتا ہے، چاہے وہ اخلاقی ہو یا سیاسی ہو یا سماجی۔ لاوٹسے کے نزدیک فطرت کا صحیح عمل یہ ہے کہ "ترقی اور نشو و نما ہو حکومت نہ ہو، تخلیق ہو ملکیت نہ ہو، عمل ہو اثبات خودی نہ ہو" لیکن ہاں یہ بھی سچ ہے کہ دنیا کی تمام حقیقتیں اس طرح مٹھی میں دبائی جائیں تو وہ سلامت نہیں رہتیں، لوگوں کی سمجھ پر زیادہ بوجھ پڑ جائے تو وہ کندھا ڈال دیتی ہے۔ لاوٹسے کی تعلیم میں



چینی فن تعمیر اور مذاق کا نمونہ

فطرت کی جو تصویر کھینچی گئی تھی وہ بہت جلد بگڑ گئی، ان کے پیرو اس بنا پر کہ فطرت کے مناسب چلنے سے کوئی نقصان نہیں ہو سکتا یہ سمجھ بیٹھے کہ زندگی صحیح طریقے پر بسر کی جائے تو انسان مر نہیں سکتا، اور وہ ایسی اکسیر تلاش کرنے لگے جو ان کی غلطیوں کی اصلاح کر دے اور انھیں ہمیشہ زندہ رکھے۔ چین کے کئی بادشاہ تھے جنھوں نے ایسی اکسیر کے ہاتھوں اپنی عمر کے رہے سہے دن گنوائے، اور عام طور پر لاؤتسے کی تعلیم جادوگری اور شعبدہ بازی بن کر رہ گئی۔

کونگ فوتسے کی تعلیم اتنی گہری نہیں تھی، مگر اسے غلط سمجھنے کا امکان بھی کم تھا، اس میں تھوڑے سے اصول اور بہت سے قاعدے تھے، بلکہ یوں کہیے اس میں مہذب زندگی کے سارے آداب بتائے گئے تھے فلسفہ، اور سچا فلسفہ اس میں بھی تھا، پر انھیں کے لئے جو اسے برداشت کر سکتے، باقی سب کے لئے آداب، قاعدے، فرائض تھے۔ کونگ فوتسے ایک جگہ پر فرماتے ہیں کہ "مذہب انسان کے دل میں باہر سے نہیں آتا، اس کا سرچشمہ انسانی فطرت کی گہرائیوں میں ہے، وہ آدمی کے دل میں پیدا ہوتا ہے، جذبات جب دل کے تاروں کو چھیڑتے ہیں تو مذہب پردے سے باہر نکلتا ہے اور یہی اس کا نکلنا، اگر اس میں قاعدہ برتا جائے، تو عبادت بن جاتا ہے۔ پوجا پرستش کی

رسموں کے علاوہ اور جو قاعدے ہوں وہ بھی کونگ فوٹسے کے خیال میں عقل اور دل کی گہرائیوں سے نکلتے ہیں، زبردستی نہیں مقرر کئے جاتے اسی سبب سے ان کا لحاظ رکھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ عبادت کے قاعدوں کا۔ کونگ فوٹسے ایک چھوٹے سے قصبے کے رہنے والے تھے، مگر انھوں نے اپنی تعلیم کے پرچار کی غرض سے سارے ملک کا سفر کیا، اور تھوڑے ہی دنوں میں شمالی چین کے سارے رہنے والے ان کے پیرو ہو گئے اور ان کی تعلیم چین کا سرکاری مذہب بن گئی۔

زندگی کو قاعدے قانون میں ایسے وقت پر جکڑ دینا جب اس کی پوری قوت ابھر نہ چکی ہو بہت نقصان پہنچاتا ہے، مگر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب زندگی کی ابھری ہوئی قوت ضایع ہو جاتی ہے اگر اسے قاعدے قانون کا سہارا نہ ملے۔ چینی تہذیب شاید ترقی کی اسی منزل پر پہنچ چکی تھی، اور کونگ فوٹسے کی تعلیم چینی طبعیت اور مزاج اور چین کے حالات سے ایسی مناسبت رکھتی تھی کہ اپنی چند خامیوں کے باوجود وہ چینی سماج کو سینکڑوں برس سنبھالے رہی، اور نشو و نما کو روکنے کی جگہ ترقی کے لئے نئے رستے نکالتی رہی۔ یہ تعلیم اخلاقی تھی، اور ایسے اخلاق کے بارے میں کہ جن کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے اتنا نہیں تھا جتنا کہ سماج سے، مکتی اور نجات سے

اتنا نہیں تھا جتنا کر خاموش پرسکون زندگی سے۔ وہ ہوس اور غصے اور خود غرضی کو اگر مار نہ سکتی تو ان پر آداب اور تہذیب کا ایسا پردہ ڈال دیتی کہ یہ عیب دوسروں کی آنکھوں میں کھٹکتے نہ تھے، اس نے ماں باپ اور اولاد کے درمیان ایسا رشتہ قائم کر دیا کہ ان میں محبت نہ ہو تب بھی گھرانے تباہ نہ ہوں، اس نے پڑوسیوں کا پاس لحاظ اور ان کی خدمت کرنے کا ایسا سبق پڑھایا کہ سزا کا خوف نہ ہو تب بھی جان اور مال سلامت رہے۔ چینی کہتے تھے کہ حکومت کے اثر کا بڑھنا ان کی آزادی کے لئے خطرناک ہوگا، کوؤنگ فوتسے نے سیاسی وفاداری یا سیاسی اتحاد پر زور نہیں دیا، مگر اس کا انتظام کر دیا کہ حکومت کے چھوٹے بڑے کام جن لوگوں کے سپرد ہوں وہ چین کی تہذیب تاریخ اور ادب سے اچھی طرح واقف ہوں، اور حکومت میں ابتری بھی پڑ جائے تو تہذیب اور معاشرت کو صدمہ نہ پہنچے۔ چین میں حکومت چلتی پھرتی چھاؤں تھی، قرار تھا تو تہذیب کو، اور اسی سبب سے کوؤنگ فوتسے نے حکومت کو بھی تہذیب کا خادم بنا دیا۔

چینیوں کی نظر عام طور سے زندگی کی دائمی حقیقتوں پر رہی ہے، اور ان کے دماغ اس قدر سلجھے ہوئے ہوتے ہیں کہ انھیں ایسے مقاصد میں الجھانا جن کی اہمیت بالکل واضح اور یقینی نہ ہو ہمیشہ بہت مشکل ثابت ہوا ہے

سپاہی چین میں اب ہیں اور پہلے بھی تھے، لیکن ان کے یہاں سپہ گری کے آداب بالکل انوکھے تھے۔ وہاں سپاہی اپنی جان جوکھم میں ڈالنا ہرگز ضروری یا قابلِ تعریف نہیں سمجھتے، اور لاؤ تسے نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ سب سے چالاک سپاہی وہ ہے جو کبھی لڑے ہی نہیں۔ معتبر لوگوں کا بیان ہے کہ پندرہ بیس برس ہوئے جب چین میں کئی سپہ سالار ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے تو کبھی کبھی ایسا ہوا کہ دو فوجیں آمنے سامنے آتے ہی مقابلہ کرنے کے بجائے بھاگ کھڑی ہوئیں، اور فتح اس کی مانی گئی جس نے پہلے یہ معلوم کر لیا کہ دشمن بھاگ گیا ہے۔ ایسی باتوں پر ہنسی تو آتی ہے، لیکن اگر آپ یہ سوچئے کہ جب لڑائی میں نہ اپنی کوئی غرض ہو نہ ملک کا کوئی فائدہ تو لڑ کر جان دینا بہتر ہے یا بھاگ جانا تو آپ یقیناً ان سپاہیوں کی بھل منسی کی داد دیں گے جو اس طرح اپنا اور اپنے بھائیوں کا خون بہانے سے پرہیز کرتے تھے۔ اور اسی زمانے ہی میں نہیں بلکہ پہلے بھی چینی کبھی اس دھوکے میں نہیں پڑے کہ تلوار کے ذریعے سے تہذیب پھیلائی جا سکتی ہے یا زندگی کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ چینیوں نے ہمیشہ اپنی تہذیب کی سرحد کو اپنے ملک کی سرحد مانا، نہ دوسرے ملکوں پر قبضہ کیا نہ دوسری قوموں کو چینی تہذیب اختیار کرنے پر مجبور کیا۔

لیکن ایک دور ایسا بھی گذرا ہے جب چینی قوم کو بادشاہوں کی حوصلہ مندی اور اس کی اپنی قوت کے ابھار نے ملک گیری کی طرف مائل کیا۔ اس ملک گیری کی صورت وہ نہ تھی جو ہم رومی سلطنت کے پھیلنے میں دیکھتے ہیں۔ چینیوں کو وہ وحشی خانہ بدوش نسلیں جو منگولیا اور دریائے تارم کی وادی کے شمال میں رہتی تھیں بہت ستایا کرتی تھیں۔ شہنشاہ شی خوانگ تی جو حضرت عیسیٰ سے کچھ اوپر دو سو برس پہلے گذرا ہے، بڑا منچلا اور بے باک آدمی تھا۔ اس نے اس تمام علاقے کو جہاں چینی تہذیب پھیلی ہوئی تھی اپنے ماتحت کیا، اپنے آپ کو پہلا شہنشاہ کہلوایا، تمام پرانی کتابوں کو لوگوں سے چھین کر جلا دیا کہ پرانی تعلیم کے نقش دلوں سے مٹ جائیں اور زندگی کی ایک نئی طرح ڈالنے کی کوشش کی۔ اسی نے شمال میں وحشی نسلوں کو روکنے کے لئے وہ دیوار بنائی جو اب تک موجود ہے اور دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتی ہے۔ چین کی تہذیب کو بدلنے کا خیال بعد کے بادشاہوں نے چھوڑ دیا مگر سلطنت بڑھانے کا حوصلہ باقی رہا، اور ہان خاندان کے عہد میں، یعنی ۲۰۶ ق م سے ۲۲۰ء تک، اور پھر تنگ خاندان کے عہد میں ۶۱۸ سے ۹۰۷ء تک تارم کی وادی، تبت اور ترکستان کے بادشاہ اور سردار چینی شہنشاہ کی برتری تسلیم کرتے رہے۔ لیکن چینی شہنشاہوں نے رومیوں

چینی تاریخ کا نقشہ

تاریخ معلوم | نہیں

۲۷۰۰

پانچ شہنشاہ

۲۴۰۰

نراج

۱۷۵۰ شانگ خاندان

۱۱۲۵

چاؤ خاندان

طوائف الملوکی — کنگ فوٹسے ۶۰۰ / ۵۰۰ لاوٹسے

۲۵۰

۲۱۰-۲۴۶ — ٹسن خاندان { شہنشاہ شی خوانگ ٹی

چین کی دیوار ۲۱۴

ہان خاندان ۲۲۰ { ہان چاؤ کی لشکر کشی سنہ ۲۰۶ عیسوی
بحر کیسپین تک ۹۸

نراج ۶۱۹

تنگ خاندان } ۹۶۰
کُن خاندان } ۱۱۳۸
چینی تہذیب کے انتہائی عروج کا زمانہ

چنگیز خاں نے پائی ینگ فتح کیا ۱۲۱۴

کی طرح ہر طرف سناٹا پیدا کر کے اس کا نام "امن" نہیں رکھا۔ انھیں بس اپنی تہذیب اور اپنے ملک کی سلامتی سے مطلب تھا، وہ دوسروں پر حکومت کرنا نہیں چاہتے تھے۔

چینی جب مغرب کی طرف بڑھے تو موقع ایسا تھا کہ کئی تہذیبیں وسط ایشیا میں آ کر مل گئی تھیں۔ سکندر کے حملے کے بعد جنوبی ترکستان میں کئی یونانی سلطنتیں قائم ہوئی تھیں جو یونان کی صنعت اور تہذیب کو ادھر لائیں، مگر خود بھی پرانی ایرانی تہذیب سے بہت متاثر ہوئیں۔ پھر اشوک کی ہمت افزائی سے بدھ مت بھی ادھر قدم بڑھا چکا تھا، اور اس کی تعلیم کا پرچار کرنے والے ایسے روادار ہو چلے تھے کہ ہر دیوتا کو گوتم بدھ کے پہلو میں جگہ دینے پر تیار رہتے۔ اس میدان میں چینی بھی پہنچے اور تہذیبی دولت کی لین دین میں شریک ہو گئے اسی وقت سے ان کی تہذیب کے عروج کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ ان کے یہاں علم کا چرچا پہلے سے تھا، وہ کاغذ بنا لیتے تھے اور چھاپنے کا ایک طریقہ بھی انھوں نے ایجاد کر لیا تھا۔ انھوں نے زندگی کے آداب سیکھ لئے تھے، اور دوسروں کی اچھی باتوں کی قدر کر سکتے تھے۔ یورپی عالم کہتے ہیں کہ چینیوں نے مصوری یونان سے سیکھی، لیکن یہ بات مشکل سے مانی جا سکتی ہے، اس لئے کہ مصوری کا خود یونانیوں میں زیادہ رواج نہیں تھا۔

اور چین کی مصوری وہاں کے رسم الخط اور فن تعمیر سے ایسی ملتی ہے، اس کے اصول ایسے نرالے ہیں کہ وہ باہر کی چیز ہو نہیں سکتی۔ تجارت کی منڈیوں میں چینیوں کا خاص مال ان کا ریشم تھا، اور تہذیب کی منڈی میں میں سمجھتا ہوں ان کا مال شائستہ زندگی کے وہ آداب اور تکلفات تھے جن سے اب تک عام طور سے لوگ ناواقف تھے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ تہذیب کے معنی ہیں دھرم ایمان کے سائے میں زندگی بسر کرنا، ضروریات پوری کرنے کا انتظام کرنا اور پھر اپنے خاص مذاق کے مناسب زندگی کو سنوارنا۔ ایک لحاظ سے تو دنیا کی ہر قوم مہذب تھی، لیکن بعض باتوں میں کمی بھی رہ گئی تھی۔ بابل، مصر، ہندوستان، یونان اور روم کے لوگ اس وقت تک قریب قریب ننگے رہتے تھے، یعنی ان کا لباس ایک چادر تھی جو ٹانگوں سے لپیٹ کر کندھے پر ڈال لی جاتی، مگر اسے جگہ پر قائم رکھنے کے لئے عام طور پر کچھ نہ ہوتا۔ چینی پہلے لوگ تھے جنھوں نے بدن کو ڈھکنا لباس کا خاص مصرف ٹھہرایا، اور اگرچہ میں یہ نہیں کہتا کہ انھوں نے دنیا کو ستر پوشی سکھائی، لیکن پورا جسم ڈھکنے کا رواج اسی زمانے میں ہوا، اور جہاں کہیں بھی لوگوں نے قدیم چادر سے کچھ زیادہ پہنا وہاں چینیوں کے کرتے پاجامے کی کسی نہ کسی صورت سے نقل کی گئی۔ کھانے پینے میں نفاست

کا شوق سب سے پہلے چینیوں کو ہوا، اور وہی تھے جنھوں نے پکانے کو ایک
فن اور باورچی کو آرٹسٹ کا مرتبہ دیا۔ لوگوں میں میل ملاقات کی رسم چین کے
باہر بھی تھی، پر وہ باتیں جنھیں ہم آداب مجلس کہتے ہیں اور اپنے بچوں کو سکھاتے
ہیں کہ سب کو جھک کر سلام کرو، ادب سے بیٹھو، بے تکی بکواس نہ کرو، کوئی کچھ
کہے تو اس کا جواب دو نہیں تو چپ رہو، آہستہ بولو، ٹھٹھا مار کر نہ ہنسو، زور سے
ڈکار نہ لو، اور پھر اس کے آگے یہ کہ اپنے غم یا غصہ یا خوشی کو دوسرے
پر ظاہر نہ ہونے دو، دوسرے کی کوئی بات ناگوار ہو تو اسے ٹال جاؤ، ان
سب تکلفات کی قدر سب سے پہلے چین میں کی گئی، ان کی قدر کرنا دنیا نے
انھی سے سیکھا اور اب تک ان سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ اٹھنے بیٹھنے اور
میل جول کے قاعدے، اگر ان کے اندر کچھ نہ ہو تو ہم ان کو بناوٹ کہتے
ہیں، لیکن چینیوں کے اخلاق بھی ایسے تھے جو بڑی گہری شائستگی کا پتہ دیتے
ہیں۔ اب تک میں نے جن نسلوں اور تہذیبوں کا ذکر کیا ہے ان سب میں خود پسندی
بہت تھی، اور غیروں کو حقیر سمجھنا ان سب کی ایک ناگوار خصوصیت تھی۔ چینیوں
میں غیروں کی عزت کرنا اور ان کی خوبیوں کی قدر پہچاننا ہر مہذب آدمی کا
فرض مانا گیا ہے، اور اسی وجہ سے وہ ایسی رواداری برتتے رہے ہیں کہ
جس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ چین میں عیسائی مبلغوں کی جو پہلی جماعت

پہنچی اس کی شہنشاہ نے بڑی آؤبھگت کی، انجیل کا چینی زبان میں ترجمہ کرایا اور عیسائی مذہب کا پرچار کرنے کی اجازت دے دی۔ پیغمبر اسلام نے مختلف درباروں میں اسلام کی دعوت بھیجی۔ رومی شہنشاہ نے بات تک نہ سنی، ایرانی شہنشاہ نے سفیروں کی بہت توہین کی، چین میں ان مسلمانوں کی بڑی قدر کی گئی، اور شاید مدینہ کے باہر سب سے پہلی مسجد چین میں شہنشاہ تائی تسنگ کے حکم سے بنی۔

یہ تھے چینیوں کے اخلاق، اور اس مشرقی تہذیب کا آپ موجودہ مغرب سے مقابلہ کرنا چاہتے ہوں تو کر لیجئے۔ اصل چیز حکومت یا دولت اور آرام کا سامان نہیں، آدمی اور ان کے اخلاق ہوتے ہیں۔ لیکن فنون لطیفہ کو دیکھئے تب بھی آپ چینیوں کو کچھ کم نہ پائیں گے۔ وقت ہوتا تو میں حسن کے اس معیار کا کچھ ذکر کرتا کہ جس میں نہ نقل کرنے کی اجازت تھی نہ اصل کو نظر انداز کرنے کی، جس نے آرٹسٹ کا یہ فرض قرار دیا کہ شکل کو شکل ہی نہیں بلکہ کیفیت اور فضا کا مظہر بنا کر دکھائے۔ ہاں، وقت ہوتا تو میں ان کرشموں کا حق ادا کرتا جو چینی مصور قلم کی ایک دو کششوں میں دکھا سکتے تھے، اس نزاکت کا جو ایک ذرا سے اشارے میں دل کا حال سنا دیتی یا پورا سماں نظروں کے سامنے کھینچ دیتی، اس نفاست کا جو سیدھی لکیر سے گھبراتی تھی مگر سادگی کی حد سے

گذر جانا بدمذاقی جانتی تھی، اس کا یا پلٹ تخیل کا جو بھوت پریت اور اژدہوں کی صورتوں کو لطافت اور آرایش کا سامان بنا دیتا تھا، ان برتنوں کا جواب انمول جواہرات کے داموں بکتے ہیں، یا ان بہتیری خوش نما چیزوں کا کہ جن کا مقصد خوش نما ہونے کے سوا کچھ نہیں۔ مگر افسوس ہمیں وہ فراغت نصیب ہی نہیں جسے چینی زندگی اور تہذیب کی اصل نعمت مانتے تھے، ہم اپنی دوڑ دھوپ میں ایسے لگے ہیں کہ کبھی کسی خوبصورت چیز پر نظر پڑی بھی تو اسے جی بھر کر دیکھ نہیں پاتے، ہمارے پاس ہر چیز کے لئے وقت مقرر ہے، نہیں ہے تو بس آدمی بننے کے لئے۔

(۷)

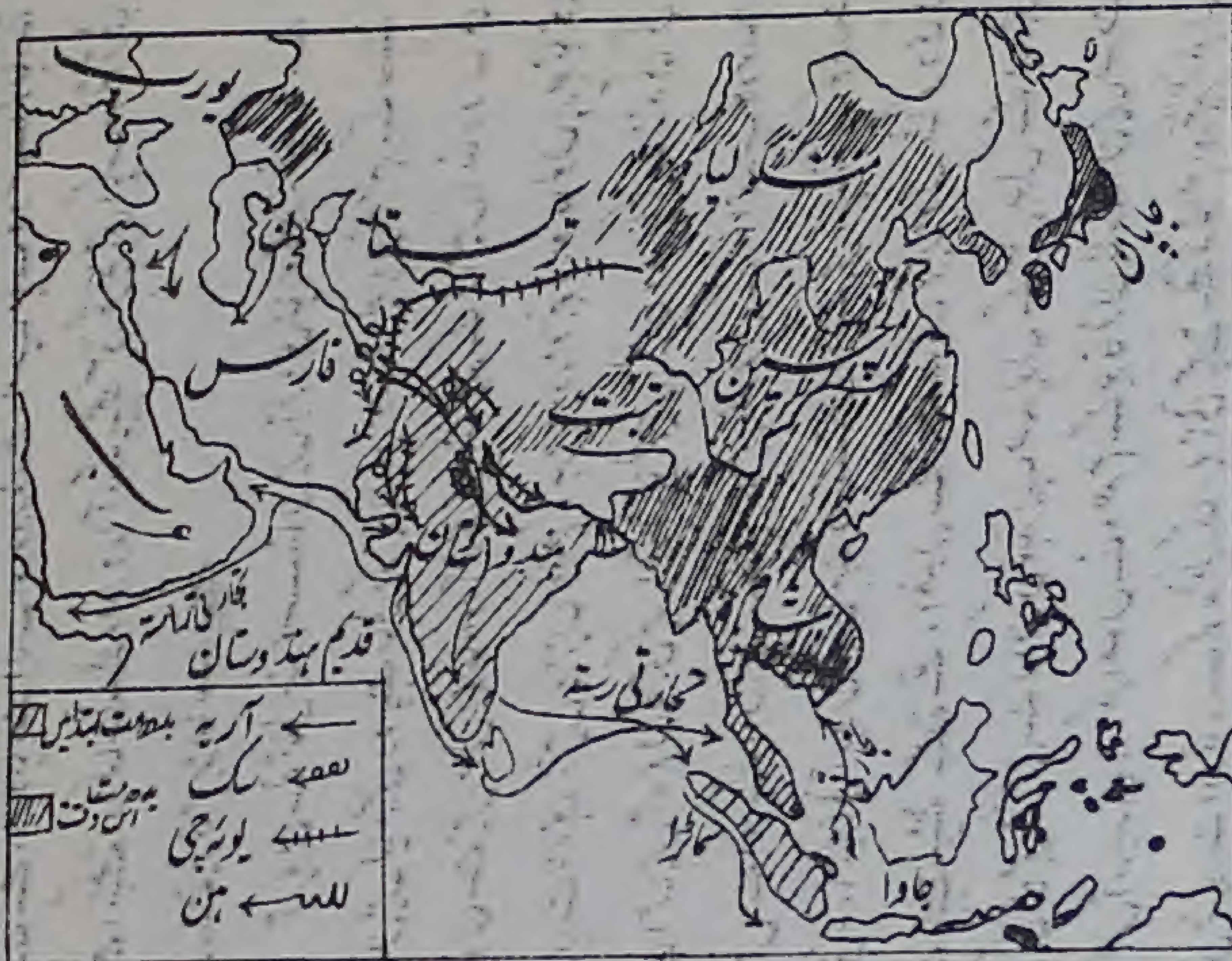
قدیم ہندوستان

میں دنیا کی کہانی بہت کچھ سنا چکا ہوں، مگر اس میں ہندوستان کا ذکر بہت کم ہوا ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ ہندوستان کی تاریخ سب کے بعد شروع ہوتی ہے، اور یہ تو ہرگز نہیں کہ ہندوستان کی قدر کسی اور ملک سے گھٹ کر ہے۔ لیکن یہ ایک قدرتی بات ہے کہ ہر ملک اور ہر مذہب کے لوگ اپنی ہی کہانی کو دنیا کی کہانی سمجھ بیٹھیں، اور اتفاق سے ہمیں جو تاریخ کے بھید بجھانے والے ملے ہیں انھوں نے ملک اور نسل اور مذہب کو ہمارے لئے قید خانہ بنا کر ہماری دنیا بہت تنگ کر دی ہے۔ میرا خیال ہے اس سے جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں انھیں دور کرنے کے لئے ہمیں آنکھیں کھول کر

اپنے ہی ملک کو نہیں، ساری دنیا کو دیکھنا چاہیے، جگ بیتی کو بھی آپ بیتی جان کر سننا چاہیے، ساری دنیا کو ایک بڑی بستی سمجھنا چاہیے جس میں کسی کا کام دوسروں کے بغیر نہیں بنتا، کسی کی کوشش دوسروں کی مدد کے بغیر بار آور نہیں ہوتی کوئی بھی دوسروں کو جانے بغیر اپنے آپ کو پہچان نہیں سکتا۔ ابھی پندرہ بیس برس پہلے تک ہم کو یہ سبق پڑھایا جاتا تھا کہ آریوں کے آنے سے پہلے ہندوستان جنگل بیابان تھا، اور اس کے رہنے والے آدمی بھی تھے تو بندروں کی طرح رہتے تھے۔ اب ایک طرف موہنجوڈرو اور ہڑپا میں جو آثار ملے ہیں اور دوسری طرف دراوڑوں کی قدیم تہذیب کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان سے پتہ چل جاتا ہے کہ آریوں کے آنے سے دو ڈھائی ہزار برس پہلے بھی ہندوستان کی تہذیب اور صنعت خاصی ترقی کر چکی تھی، اور اس تہذیب کے آثار نہ جانے کہاں کہاں ویرانوں میں یا بستیوں میں ہمارے پیروں تلے دفن ہیں۔ یہ اب ہمارے حوصلے اور ہمارے شوق کی بات ہے کہ ہم ان آثار کو تلاش کریں، اپنی زندگی کو اچانک کسی ایک وقت سے شروع نہ کریں بلکہ یہ سمجھیں کہ وہ دن کے اجالے کی طرح آہستہ آہستہ بڑھی۔ دنیا کی تاریخ ہمارے سامنے موجود ہے، جو کچھ اور جگہ ہوا قریب قریب وہی ہمارے یہاں بھی ہوا ہوگا۔ انسان کا بچپن اور بےبسی میں قدرت کی گود میں پلنا، پھر اس کا

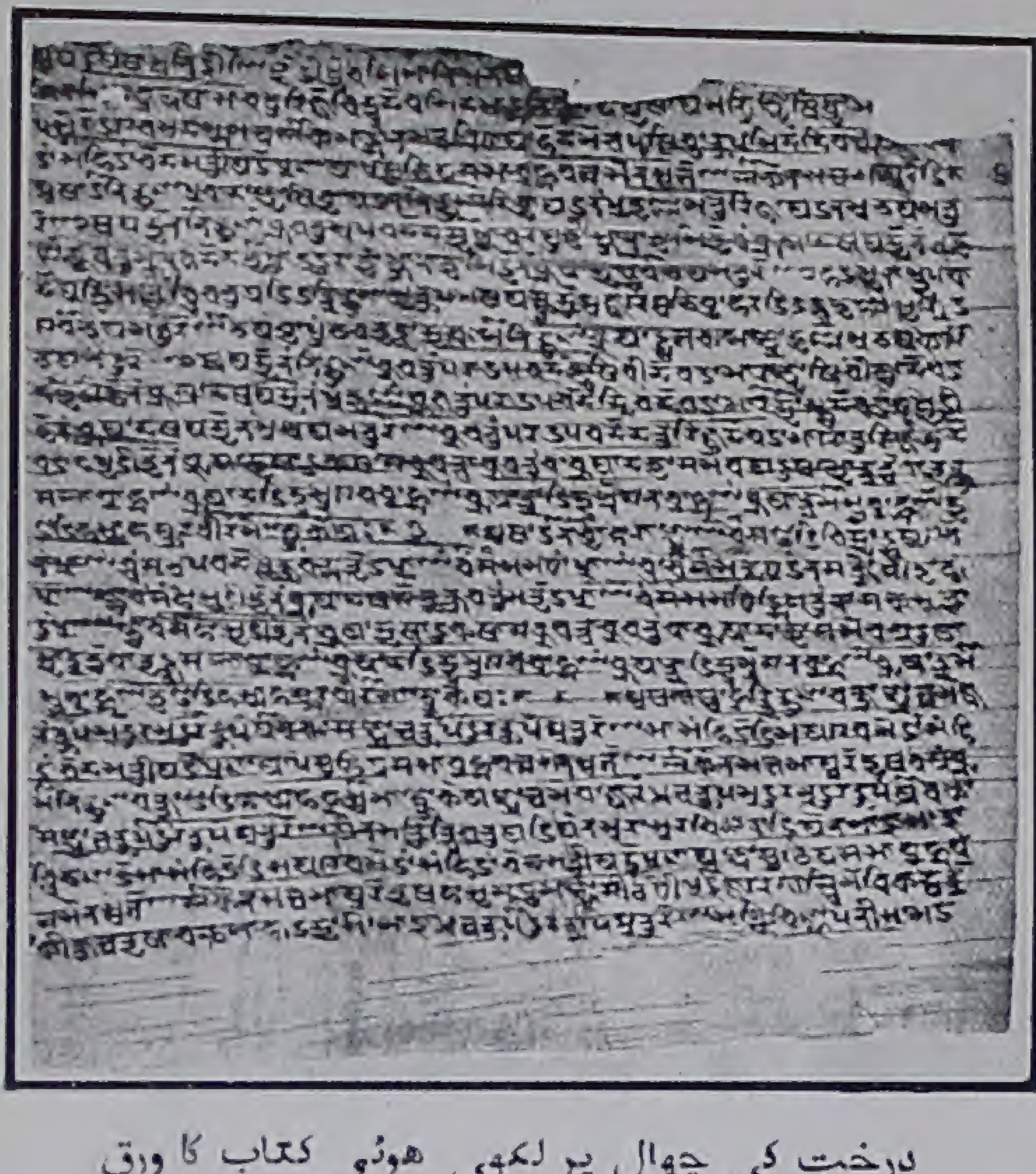
ڈرتے ڈرتے اپنے پیروں پر چلنا، کبھی گرنا اور کبھی سنبھل جانا، قدرت سے الگ ہو کر اپنی محنت، اپنی ہمت اور سوجھ بوجھ کا سہارا لینا، گھر اور بستی اور شہر آباد کرنا، کام کی تقسیم اور اتحاد ئیل کے تانے بانے سے زندگی، قانون اور تہذیب کا کپڑا بن کر اس سے اپنے بدن کو ڈھکنا اور سنوارنا، یہ سارا تماشا ہماری بھارت ماتا نے بھی دیکھا ہو گا، اور وہ ایک آریہ نسل ہی کی ماں نہ تھی بلکہ بہت سے بچوں کو پال چکی تھی، اور اس کے دل اور اس کی گود میں اور بہت سے بچوں کے لیے جگہ تھی۔

آریوں کے آنے سے پہلے سندھ اور جنوبی پنجاب اور شاید گنگا کی وادی میں جو لوگ آباد تھے ان کی صورت، رہن سہن اور پہناوے سے ہم صحیح اندازہ نہیں کر سکتے کہ وہ کس نسل کے تھے، غالباً وہ دراوڑ ہی تھے، اور بلوچستان کے دروں سے آ کر ادھر اُدھر پھیلے۔ دکن اور جنوبی ہندوستان میں اسی دراوڑ تہذیب کا اپنا الگ کاروبار تھا۔ اس کا وندھیاچل کے اتر کی طرف رہنے والوں سے زیادہ تعلق نہ تھا، مگر پورب میں جنوبی ہند والے جاوا، سماٹرا اور ان کے آگے تک پہنچ گئے پچھم میں عرب، مصر اور بحر روم کے تاجروں سے ان کا لین دین تھا، اور ابھی تھوڑے دن ہوئے دکن میں ایک تابوت یعنی وہ صندوق سا جس میں مردے رکھے جاتے تھے، زمین سے نکالا گیا ہے جس کی وضع سومیر، اور اٹلی کے


قدیم هندوستان
فارس
تبت
جاپان
جاوا
آریه
هن

ضلع ایٹروریا کے تابوتوں کی سی ہے۔ ہندوستان کے اس وقت شاید دو ٹکڑے تھے، مگر دنیا سے الگ اور دور نہ تھے، سب ایک دوسرے کو جانتے تھے، سیکھتے اور سکھاتے تھے، اور ذرا آگے پیچھے سہی مگر پھر بھی ایک ساتھ ترقی کے رستے پر قدم بڑھا رہے تھے۔

آریوں نے شمالی ہندوستان میں آکر وہی کیا ہوگا جو انھوں نے یونان میں کیا، یعنی وہ پہلے خالی جگہ میں آباد ہوئے، پھر ان کا شہر کے رہنے والوں سے میل جول بڑھا، اور آخر کار وہ اتنا سیکھ گئے کہ انھیں استادوں کی ضرورت نہ رہی۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ ہڑپا اور موہنجوڈرو والوں پر جو تباہی آئی اس میں آریوں کا بھی کچھ ہاتھ تھا یا نہیں، لیکن وہ اچانک زندگی کی محفل سے اٹھ گئے، اور شمالی ہند میں آریوں کے سوا تہذیب کا دعوے دار کوئی نہ رہا۔ یونانی آریوں کی طرح ہندوستان والے بھی اپنے آپ کو قدرت کے چہیتے بیٹے سمجھتے تھے، انھوں نے صنعت میں تو برسوں شاگردی کی ہوگی، یہ بھی ناممکن ہے کہ ان کی تہذیب صدیوں کے میل جول کے بعد بھی خالص آریہ رہی ہو، مگر انھوں نے دھرم کے جو قانون بنائے ان میں صرف اپنی ضرورت اور فائدے کو مدنظر رکھا۔ یونانی سمجھتے تھے کہ غلام اور غیر نسلوں کے لوگ مہذب شہری زندگی کے حقدار نہیں ہو سکتے، آریوں نے



درخت کی چھال پر لکھی ہوئی کتاب کا ورق

غیر آریوں کو اپنی سماج سے بھی خارج کر دیا۔ ان کا مذہب اور ان کی مقدس کتابیں، ان کا شاعرانہ فلسفہ اور ان کے رشیوں اور بن باسیوں کی نیک اور پاک زندگی، عملاً نہیں تو اصولاً ان کی حکومت اور تجارت صرف ان کے اپنے لئے تھی۔ اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ مذہبی رسموں کی تعداد اور ان کی پیچیدگی بڑھتی گئی، بعض لوگ تھے جو ان رسموں کی حقیقت جانتے تھے، مگر انھوں نے یہ بات اپنے دل میں رکھی۔ اتھروویدسے معلوم ہوتا ہے کہ آریوں کے آتش پرستی کے مذہب میں ان سے پہلے کی جان پرستی کے بہت سے عقیدے گھس آئے تھے، وہ بعض جانوروں اور بعض درختوں کو دیوتا نہیں تو دیوتاؤں کے برابر عزت کے لائق ماننے لگے تھے' ان میں جھاڑ پھونک، ٹونے ٹوٹکے کا رواج ہو چلا تھا' اور یہ تمام باتیں ان کے اصل مذہب سے بہت دور تھیں۔

پھر ایک وقت آیا جب ان کے فلسفے اور اعلیٰ اخلاقی تعلیم کے خلاف تو نہیں مگر ان کے نسلی گھمنڈ اور ان کے دھرم کے خلاف بڑی سخت بغاوت ہوئی۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ گوتم بدھ آریہ تھے یا کسی ملی جلی نسل کے سپاہیوں کے خاندان سے تھے، وہ خالص آریہ ہوتے تو شاید ہی اپنی نسل کے تعصبوں سے اتنے پاک ہوتے کہ اپنی تعلیم کو ہر بات میں آریوں کے

اصول اور قاعدے کی ضد بنا دیں، اور اگر گھٹیا ذات کے ہوتے تو انھیں علم حاصل کرنے اور روحانی تجربے کرنے کا اتنا اچھا موقع نہ مل سکتا جتنا کہ انھیں ملا لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ ہندوستان کے جس حصے میں وہ پیدا ہوئے تھے وہاں مدت سے لوگوں کے دل بے چین تھے اور ان سے پہلے بھی چند بزرگ آریوں کی مقدس کتابوں کو تسلی اور رہنمائی کے لئے ناکافی ٹھیرا چکے تھے ہم اس بحث کو بے کار سمجھ کر چھوڑ سکتے ہیں۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ گوتم بدھ نے جو تعلیم دی وہ ایک آریہ دھرم کے خلاف نہیں بلکہ اس وقت کی دنیا کے اصول اور قاعدے کے خلاف تھی۔ لوگ دیوتاؤں کو مانتے تھے، سمجھتے تھے کہ انھیں حاکموں کا سا اختیار ہے، وہ چاہیں تو ہماری مرادیں پوری کر سکتے ہیں۔ گوتم بدھ نے کہا دیوتا کیسے، کرم کا قانون ہے کہ ہم جیسا کریں ویسا بھریں، اس قانون کو آدمی کی آرزوئیں توڑ سکتی ہیں نہ دیوتاؤں کی قوت۔ ایسے لوگ تھے جنھیں کوئی دنیا کی نعمت درکار نہ تھی، وہ موکش، نجات کی تمنا رکھتے تھے، اور اس خیال میں کہ جسم اور جسمانی خواہشیں ہم کو گمراہ کرتی ہیں وہ تپس کر کے طرح طرح سے اپنے آپ کو تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ گوتم بدھ نے کہا کہ میں اس راستے کی آخری منزل تک ہو آیا ہوں اور مجھے کچھ نہ ملا۔ اپنے آپ کو دکھ دینا بیکار ہے، ہاں نفس کو قابو میں رکھو، کہ نفس کا غلام کرم کے پھندے سے آزاد ہو ہی

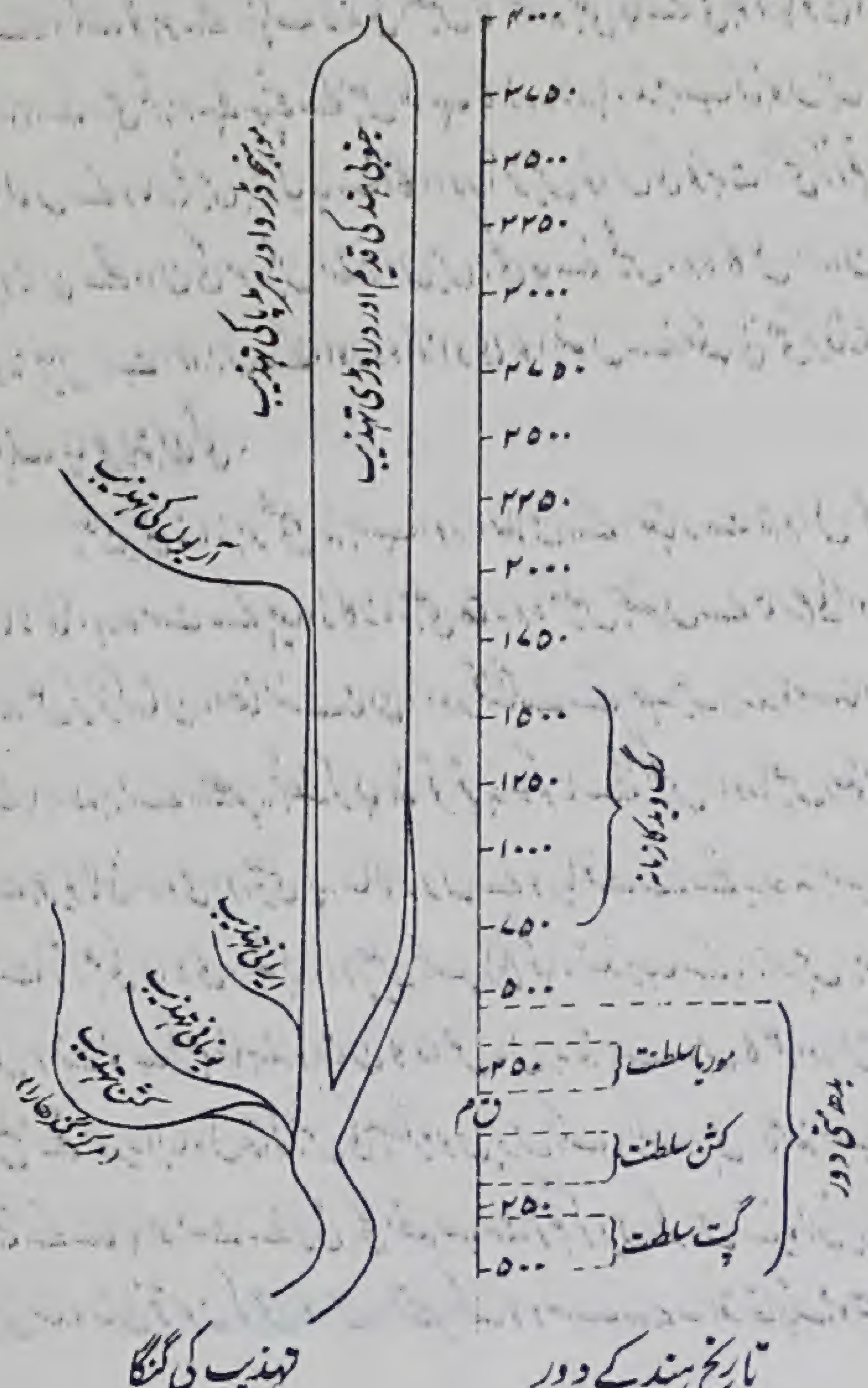
نہیں سکتا۔ لوگ رسم ادا کرنے کو، پوجا پرستش کو، قربانی کو اور دان دینے کو
دینداری سمجھتے تھے، گوتم بدھ نے کہا کہ اصل چیز نیک نیت اور اچھے اعمال
ہیں، سچا دیندار وہ ہے جو سمجھ اور دل کی روشنی میں اپنے ارادے کی قوت
سے خدمت اور ایثار کے رستے پر چلے، کہ یہی رستہ ہمیں گھر تک لیجا سکتا ہے
گوتم بدھ نے یہ سب کہا تو بہت کہا، کہ اس وقت بھی ہم یہ باتیں بالکل صاف
صاف کہنے کی ہمت نہیں کر سکتے، اور ان کی شخصیت اور زبان میں بڑا
جادو ہو گا کہ لوگوں نے ان کا منہ بند نہیں کر دیا۔ لیکن اصل میں یہ باتیں ان کے
مخالفوں کو اتنی ناگوار نہ ہوئی ہوں گی جتنا ان کا یہ کہنا کہ آدمی آدمی سب برابر
ہیں، آزاد وہ ہے جو نیک زندگی بسر کرے، کامیاب وہ ہے جو نفس کو قابو میں
کرے۔ آدمی کو جہاں جانا ہے وہاں نہ برہمن کی ذات کام آ سکتی ہے نہ کشتری
کی تلوار نہ دیش کی دھن دولت، تو پھر آدمیوں کی ایسی تقسیم کیوں کیجئے، میری
طرح اچھوت کے ہاتھ کا کیوں نہ کھائیے، طوائف دعوت دے تو اسے کیوں
نہ قبول کیجئے۔ اور گوتم بدھ جانتے تھے کہ ذات کی تقسیم کو مٹانے کے لئے اونچی
ذات والوں کو مخاطب کرنا فضول ہے، اور علم کو کتاب میں چھپا کر رکھنا غلط۔
انھوں نے اپنی تعلیم کا پرچار کرنے کے لئے جسے بھی بھیجا اس سے کہا کہ جہاں
جاؤ وہاں کی بولی سیکھو، پر فضا جنگلوں یا امیروں کے گھروں کو ٹھکانہ نہ بناؤ

شہروں کی خاک چھانو، جھونپڑوں میں مہمان رہو، تمہاری باتیں جی لگا کر سننے والے وہیں ملیں گے، تمہارا کام وہیں ہو گا۔

گوتم بدھ کا مذہب پہلا مذہب تھا جس کا پرچار کیا جا سکتا تھا۔ اس سے پہلے کے مذہب نسلی تھے یا مقامی تھے، پجاری کا دیوتا سے قریب قریب خاندانی رشتہ تھا، مذہب کو عقیدے اور اخلاقی تعلیم سے سروکار نہ تھا، وہ بس ایسی رسموں کا مجموعہ تھا جنھیں ادا کرنا خاص قبیلوں یا خاندانوں کا حق اور فرض تھا۔ بدھ مذہب نے انسان کی نظر کو اتنا اونچا کیا کہ وہ برادری اور ذات، نسل اور ملک، رسم اور تہوار، منتیں پوری کرنے والے دیوتاؤں اور دیویوں کی حد سے گذر کر ساری انسانی دنیا کو دیکھ سکے، اور غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں وہ تمام اوصاف موجود تھے جنھوں نے بعد کے مذہبوں کو چمکایا، اور وہ اوصاف بھی جو تہذیب میں جان ڈالتے ہیں۔ ہن میں وہ اعتدال پسندی بھی جو یونانی تہذیب کا جوہر مانی جاتی ہے، وہ خاکساری جس نے عیسائی مذہب کو سرفراز کیا، وہ مساوات جو اہل اسلام کا مایۂ ناز ہے۔ اور پھر اسے شہنشاہ اشوک جیسا پرچار کرنے والا مل گیا کہ جس نے اپنا تاج اتار کر سنگھ کے قدموں پر رکھ دیا۔ لیکن بدھ مت کو ماحول بہت خراب ملا تھا، اس کے رہبر عام خیالات سے متاثر ہو کر جوگی اور بن باسی نہیں ہوئے تو دنیا

سے الگ تو ہو گئے۔ نیک زندگی انھیں کا حصہ سمجھی جانے لگی جو دنیا کو تج دیں، مساوات رہی مگر اونچ نیچ کے میل ملاپ کا زور نہ رہا، مذہب کتابوں میں اور عالموں کے دماغ میں بند کیا جانے لگا، اور آخر میں تو اس کی نوبت آگئی کہ گوتم بدھ دیوتا بن گئے، ان کی مورتیں مندروں میں رکھی جانے لگیں، وہ کامل انسان کا نمونہ نہیں رہے، خدا بن گئے، اور وہ آزادی جو انھوں نے سکھائی تھی گرفتاری کا ایک نیا طریقہ بن گئی۔

لیکن یہی زمانہ جو صحیح مذہب اور اخلاق کے اعتبار سے زوال کا زمانہ تھا، بدھ مت کے پھیلاؤ کا زمانہ بھی تھا۔ وہ نسلیں جنھوں نے تارم کی وادی سے نکل کر ترکستان، افغانستان، اور کنشک کے عہد میں ہندوستان کے بہت بڑے حصے پر قبضہ کر لیا تھا گوتم بدھ کو ماننے لگیں، اور انھیں رستوں سے جو یونانی، رومی اور چینی سپہ سالاروں نے دریافت کئے تھے بدھ مذہب تبت، تارم کی وادی، منگولیا، اور چین تک پہنچ گیا۔ تہذیب کے بازار میں جو اس وقت خوب گرم تھا ہندوستان کا خاص مال یہ مذہب، اس کا علم اور اس کے مبلغ تھے اور یہ ایسا مال تھا کہ جس کی سینکڑوں برس تک مانگ رہی۔ عام مذہب بننے کے لئے بدھ مت نے اپنی اعلیٰ خصوصیات تو گم کر دیں مگر اس نے یونانی، ایرانی، چینی ہندوستانی قوموں کو جن کا اس وقت ایک دوسرے سے سابقہ تھا ایک دوسرے



تہذیب کی گنگا

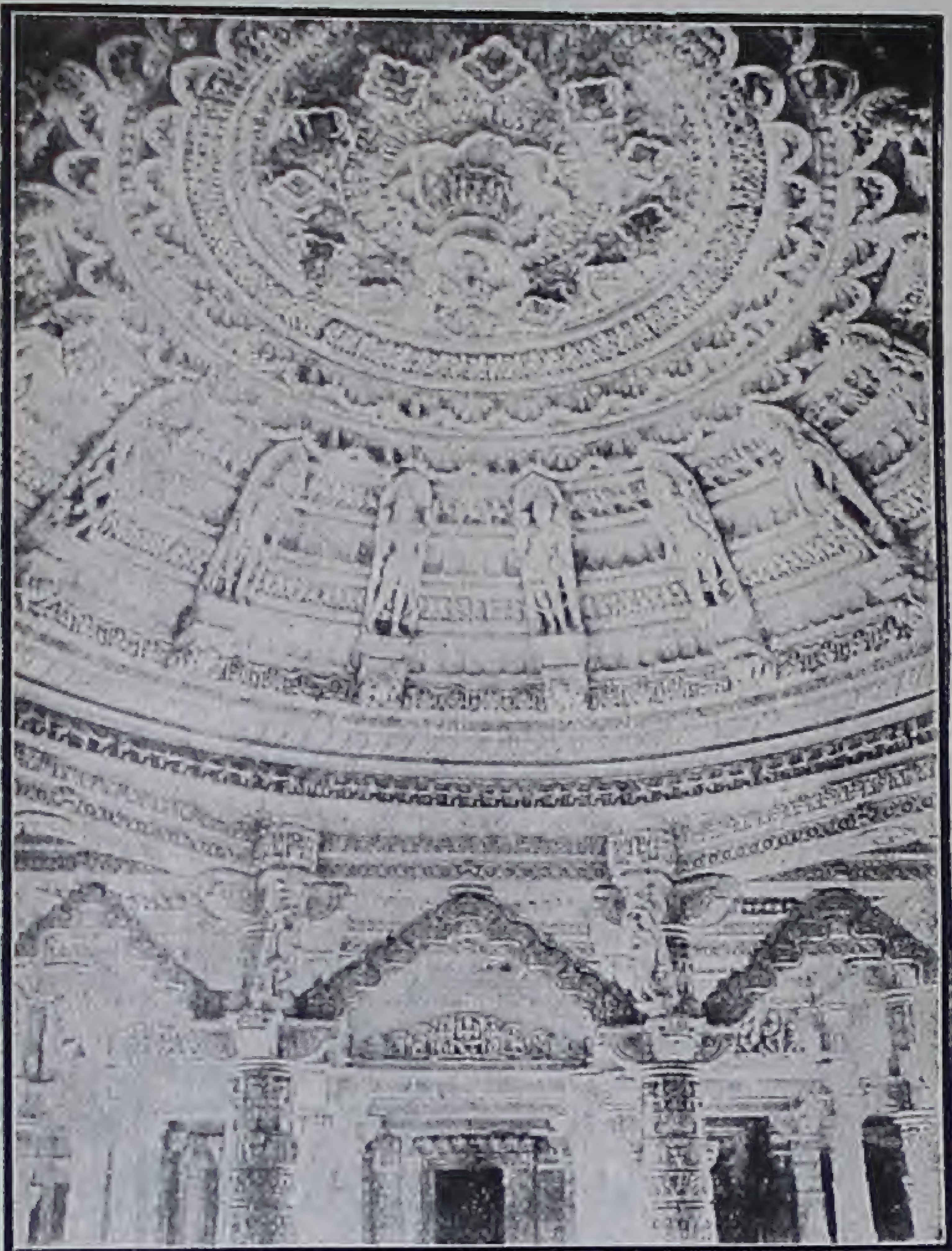
تاریخ ہند کے دور

کا اثر قبول کرنے کے لایق بنا دیا، اور یہ اسی کی پیدا کی ہوئی بے تعصبی اور نظر کی وسعت کا نتیجہ ہے کہ ہم چین، ہندوستان اور ایران میں تہذیب کے ایک نئے اور روشن دور کو شروع ہوتے دیکھتے ہیں۔

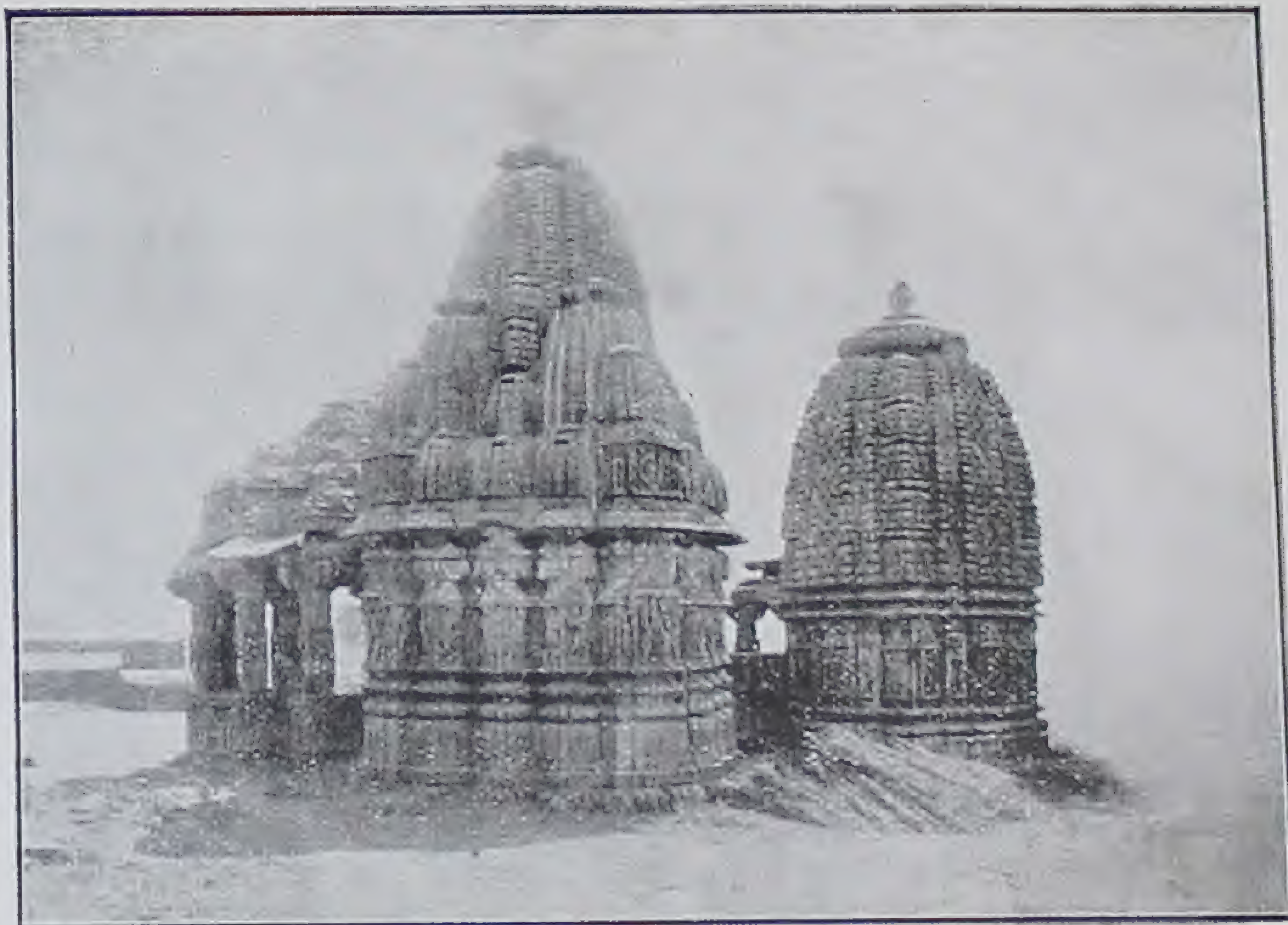
ہندوستانی تہذیب کا نیا دور گپت عہد کی تہذیب کہلاتا ہے، لیکن اصل میں وہ گپت سلطنت سے بہت پہلے شروع ہوا اور بعض حصوں میں اس کے بہت بعد تک چلا۔ اس کا مرکز مشرق میں نہیں تھا بلکہ مغرب میں، اس تجارتی شاہ راہ پر جو بروچ اور سورت کی بندرگاہوں سے شمال کی طرف متھرا کو اور پورب کی طرف پریاگ اور پاٹلی پوتر کو جاتی تھی۔ اس حصے پر جسے اب ہم مالوہ اور گجرات کہتے ہیں، کئی سو برس تک سک اور کشان، یعنی اسی نسل کے لوگ جو بعد کو ترک کہلائے، حاکم رہ چکے تھے۔ یہاں آپ کو اس زمانے میں ایرانی، یونانی، عرب سبھی طرح کے لوگ ملتے، جن میں ہمارے اپنے دیس کے لوگ بھی بڑی حیثیت رکھتے تھے۔ دوسری طرف کابل اور پشاور سے ٹکیلا اور متھرا کو جو شاہ راہ آتی تھی اس سے بھی ہندوستان کے اندر بڑی دولت پہنچی، اور ادھر اور ادھر سے جو کچھ آیا وہ گپت بادشاہوں کے دربار میں پہنچا۔ آریہ دیہات کو پسند کرتے تھے، شہروں کا رہن سہن انھیں ایک آنکھ نہ بھایا۔ گپت تہذیب شہری تہذیب تھی، جس میں اصل نعمت شائستگی، نفاست، تہوار، میل ملاقات، سیر تماشے

اور اس طرح کی چیزیں تھیں۔ آریوں کے زمانے میں دولت زمین اور زمین کی پیداوار تھی گپت عہد میں صنعت اور تجارت پر بھروسا تھا، اور یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں بدھ متی مبلغوں کی رہنمائی میں ہندوستانیوں نے مصر سے لے کر چین اور جاپان تک اپنا کاروبار پھیلایا۔ آریہ دھرم کو سب سے بڑا مرتبہ دیتے تھے، انھیں سب سے زیادہ فکر مذہب، فلسفے اور قانون کی تھی، اور وہ زندگی کو اپنے عقیدوں کا پابند رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ گپت عہد میں مہذب زندگی کا لطف اٹھانا سب کا حوصلہ اور سب کا دھرم تھا، اس زمانے میں ادب اور فنون لطیفہ نے اپنے کرشمے دکھائے اور دولت اور آسائش نے ملک کو ایک رنگین باغ بنا دیا۔

ایک زمانے کا دوسرے سے مقابلہ کرنے میں میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ ایک کو دوسرے سے بہتر ثابت کیا جائے، بلکہ یہ دکھانا ہے کہ ایک سلسلہ جو موہنجو ڈرو کی تہذیب سے شروع ہوا وہ آکر گپت عہد کی شہری تہذیب پر ختم ہوا، اور اگر ہم اس زمانے کی تاریخ کو ایک سلسلہ مان لیں تو ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ وہ بہت مکمل تھا، اس میں اپنشدوں اور بھگوت گیتا کی تعلیم آجاتی ہے اور گوتم بدھ کی کامل شخصیت بھی، رگ وید کے بھجن اور کالیداس کی وہ نظمیں بھی جنھوں نے آزاد انسان اور اس کی زندگی کو مناظر، موسم، فضا کی خوشبو سے بسا دیا،



کوہ آبو کے مشہور جینی مندر کی چھت



کچھوا ھو کا ایک مندر

اور سب کو ایک دل آویز تصویر کے مختلف رنگ بنا دیا، اس میں آریہ بھٹ اور برہم گپت کا علم آجاتا ہے، اور پنچ تنتر کی وہ بے مثل کہانیاں اور نصیحتیں بھی جنھوں نے ہندوستانیوں کی حکمت اور دانائی کا ساری دنیا میں ڈنکا بجایا، تنجور اور مدورا کے مندر اور اجنتا کی مصوری، بادشاہوں کا انتظام اور تاجروں کی حوصلہ مندی بھی، غرض وہ تمام چیزیں جنھیں حاصل کرنا انسان کا حصہ سمجھا گیا ہے اور وہ تمام آرزوئیں جن میں تڑپنا انسانی زندگی کی شان ہے۔

(۸)

عیسائی مذہب

اب ہم اس زمانے تک پہنچ گئے ہیں جب وہ بیگانگی جو فاصلے، قدرتی رکاوٹوں اور مذہب اور تہذیب کے فرق کی بدولت قائم تھی مٹائی جا چکی تھی اب کوئی بڑا ملک، کوئی بڑی قوم، عقیدوں اور روایتوں کا کوئی بڑا سلسلہ نہیں تھا جو اپنے آپ کو دنیا سے الگ رکھ سکتا تھا، آج کل کی طرح آمد و رفت کی آسانیاں نہیں تھیں، لیکن دنیا بہت بڑی ہو گئی تھی، ملک گیری کے حوصلے نے جو سامراج بنائے تھے ان سب کے ملنے سے سامراج کا ایک تصور تیار ہو رہا تھا جس کی کوئی حد مقرر نہیں تھی اور جو خدا کی خدائی سے برابری کا دعوے کر سکتا تھا، انسان کی فطرت تو نہیں بدلی اس کی ضروریات وہی رہیں اور انھیں

پورا کرنے کے کوئی نئے طریقے دریافت نہیں کیے جا سکے، لیکن اب انسان کو ناگہانی آفتوں کا اور کھلے ہوئے ظلم کا، ایک کی غرض دوسرے کی مجبوری، ایک کے عیش آرام اور دوسرے کی محتاجی کا اتنا احساس ہو گیا تھا کہ قدرت کی پرستش، بھولی بھالی باتیں، رنگ برنگ کی کہانیاں اس کے دل کی تسکین کے لئے کافی نہیں تھیں اب ایک کے لئے حقیقت وہی چیز ہو سکتی تھی جو سب کے لئے یکساں حقیقت ہو، جو امیر اور غریب، خوش حال اور بدنصیب کو الگ الگ ذاتوں میں تقسیم نہ کرے بلکہ اس کی ہدایت اور اس کا سہارا بن جائے اور دنیا میں نہیں تو خدا کے حضور میں سب کو ایک سطح پر لے آئے یہ سمجھئے ایک مطالبہ تھا جو اس وقت کے حالات اور زندگی نے انسان کے سامنے پیش کیا اور اس وقت کے عالم گیر مذہب طرح طرح کے جواب ہیں جو انسان کے جذبہ دینی نے اس کی طرف سے دئے۔ گوتم بدھ ان کی تعلیم اور اس کے پھیلنے کا حال میں آپ کو سنا چکا ہوں، خاص ایران میں زرتشت کا مذہب پہلے سے موجود تھا جس میں ہمیں یہ نئی بات ملتی ہے کہ سنسار اور انسانی زندگی ہرمزد اور اہرمن نیکی اور بدی کی قوتوں کا میدان جنگ ٹھہرائی گئی اور اسی زمانے میں اس تعلیم نے متھرا کا مت بن کر مغرب اور جنوب میں بڑی دور تک اپنا اثر پھیلایا۔ اسکندریہ میں سکندر کے سپہ سالار ٹولمی (بطلیموس) نے ایک کتب خانہ اور یونیورسٹی قائم کی تھی جہاں اس وقت کے مذہبوں، عقیدوں اور

دیوتاؤں کو علم اور عقل کے زور پر عالم گیر حیثیت دینے کی کوشش کی جارہی تھی، لیکن حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے کوئی پچاس برس پہلے یہاں کے کتب خانے میں آگ لگ چکی تھی اور یہاں کا علمی کاروبار بہت مندا پڑ گیا تھا، بدھ مذہب کے بعد جو تعلیم واقعی عالم گیر ہونے کا دعوے کرسکتی تھی حضرت عیسیٰ کی تعلیم تھی۔ اور انھیں کی شخصیت تھی جو بادشاہوں اور دیوتاؤں سب پر چھاگئی۔

حضرت عیسیٰ کی شخصیت کو گوتم بدھ اور زرتشت کی شخصیت اور عقیدوں سے کوئی مطلب نہ تھا۔ وہ یہودی تھے اور اپنا پیغام سنانے میں ان کو اس کا خیال رکھنا ہوتا تھا کہ وہ مخاطب کس کو کررہے ہیں۔ لیکن ان کی ذات میں حضرت ابراہیم یا حضرت موسیٰ نے نیا جنم نہیں لیا تھا، ان کے مدنظر اپنی ہی ایک قوم یا سماج نہیں تھی، وہ اس کے دھرم یا اس کی روایتوں اور پرانوں کو اس نئی دنیا میں جسے وہ بنانا چاہتے تھے کوئی خاص مرتبہ نہ دیتے تھے، پر ان کے بعد جب ان کے ماننے والوں کے پاس ایک جیتی جاگتی شخصیت کا سہارا نہ رہا، اور ان میں اپنی زندگی، اپنے دھرم، اپنی عبادت کو ایک ظاہری شکل دینے کی ضرورت ہوئی تو ان پر ہر طرف سے اثر پڑنے لگا، انھیں قوموں کی فطرت اور عادت، ان کا مذاق اور ان کی ذہنیت کا لحاظ رکھنا تھا، انھیں ایسے سوالوں کا جواب دینا تھا جنھیں حضرت عیسیٰ سے پوچھنے کا کسی کو خیال نہ ہوتا مگر جن کی حضرت عیسیٰ کے بعد

ہر طرف سے بوچھار پڑنے لگی تھی۔ ایک بہت بڑی بات یہ بھی تھی کہ ہزاروں لاکھوں آدمی جو عیسائی مذہب اختیار کر رہے تھے ان کی پرورش دوسرے عقیدوں میں ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنا مذہب تو بدلا مگر اپنے ذہن اور تخیل کی عادتیں نہ بدل سکے تھے اور پہلے کے تصورات کا نقش دل سے مٹا نہ سکے تھے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم کو کلیسا اور قانون، پرستش کے طریقوں اور نیک زندگی کے ایک خاص مفہوم میں جنم لینا پڑا جو ان کی اصل تعلیم سے دور تھا مگر اس میں اس زمانے کے خیالات، آرزوئیں، حوصلے، اور تصور سما گئے اور اس طرح حضرت عیسیٰ کی تعلیم وقت اور ماحول کے سانچے میں ڈھال لی گئی۔

اسی وجہ سے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اس زمانے کے مذہبوں پر اور ان لوگوں کی حالت پر جو مذہب کی سب سے زیادہ قدر کرتے ہیں ایک نظر ڈال لیں حضرت عیسیٰ یہودی تھے اور فلسطین میں پیدا ہوئے، اس لئے ان کی تعلیم پر نہیں تو اس شکل پر جو اس تعلیم نے لوگوں کے دلوں میں اختیار کی، ان جذبات پر جسے اس نے چھیڑا، ان حوصلوں پر جسے اس نے ابھارا، یہودیوں کی روایات، ان کی سیرت، اور حالات کا بہت گہرا اثر پڑا۔ یہودی فلسطین میں اس شاہ راہ پر آباد تھے جو مصر سے شام اور عراق کو جاتی تھی، اس شاہ راہ سے تاجروں کے قافلے گذرتے تھے اور اس پر فوجیں بھی ادھر سے اُدھر جاتی تھیں، پھر فلسطین میں سمندر کے

کنارے پر تجارت اور تاجر قوموں کے دو تین بڑے مرکز تھے۔ اس طرح یہودی صدیوں تک مصر اور بابل کی جنگوں میں پستے اور فونیقی تاجروں کے ہاتھ لٹتے رہے، بابل کے ایک اسیری بادشاہ نے بغاوت کی سزا میں انھیں ان کے دیس سے لے جاکر بابل میں بسا دیا اور وہ پردیس کی قید سے چھوٹے تو ان میں آپس کی لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ جب حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے تو فلسطین کے دکھن میں رومیوں کی اپنی حکومت تھی اور اتر میں ان کے ماتحت ایک دیسی ریاست تھی جو ان سے بھی زیادہ بے پروائی اور ظلم کرتی تھی۔ رومیوں نے اور بہت سے ملکوں کو فتح کیا تھا اور قوموں کو اپنے پیروں تلے کچلا تھا، انھوں نے ایک فلسطین ہی میں نہیں بلکہ ہر جگہ دلوں کو زخمی اور ہمتوں کو پست کیا تھا، ہر جگہ انھوں نے چند امیروں کے لئے دولت کمانا آسان کر کے لاکھوں غریبوں کو خاک اور خون میں لٹایا تھا۔ لیکن اور جگہ ایک قوم یا ایک ملت ہونے کا احساس اتنا قوی نہیں تھا جتنا کہ یہودیوں میں، اور جگہ لوگ کبھی اپنے آپ کو ایک سورما کی اولاد سمجھتے تھے تو اس وقت تک یہ بات بھول گئے تھے، کبھی اپنے خاص دیوتا ہی کے سامنے سر جھکاتے تھے تو اب اس کے ساتھ کئی اور دیوتاؤں کو پوجنے لگے تھے۔ یہودیوں میں یہ صفت تھی کہ وہ شروع سے ایک خدا کو مانتے تھے اور آخر تک اسی کو مانتے رہے، اس کا انھوں نے دوسروں کی دیکھا دیکھی نام

نہیں بدلا اور اس سے کبھی پھر بھی گئے تو اس کے ساتھ اور کسی کو شریک نہیں کیا۔ بابل کی قید کے زمانے میں جو حضرت عیسٰی سے پانچ ساڑھے پانچ سو برس پہلے گذرا وہ خدا کو اپنی نسل کا دیوتا ہی نہیں بلکہ دنیا جہان کا خدا ماننے لگے اور اپنے دیس کو واپس پہنچنے کے بعد وہ اپنے عقیدوں کا پرچار بھی کرنے لگے جس کا پہلے انھیں کبھی خیال نہ ہوا تھا۔ لیکن اگر آزمائش اور امتحان میں ان کا مذہب پورا اترا تو ان کی زندگی اور دنیاوی حیثیت بگڑتی رہی، وہ نہ کبھی پوری طرح آزاد ہو سکے اور نہ انھیں کبھی وہ اطمینان نصیب ہوا جو ضروریات پوری ہونے اور ایک ڈھنگ سے زندگی بسر کرنے سے حاصل ہوتا ہے، عزت اور آسودگی کی آرزو دبتے دبتے جب ایک دفعہ ابھری تو اس نے ایک ایسی شخصیت کی امید کا روپ لیا جو مسیحا بھی ہو اور شہنشاہ بھی، جو دین کو پھیلائے اور بے دینی کو مٹائے، ظلم کو دور کرے اور انصاف کو تخت پر بٹھائے، اور یہودیوں کو دنیا کی حکومت دے کر ان وعدوں کو پورا کرے جو پیغمبروں نے ان سے کئے تھے کہ مذہب میں پکے ہوئے تو دنیا میں سرخ رو بھی ہوں گے۔

معلوم نہیں حضرت عیسٰی نے مسیحائی اور شہنشاہی کا دعوٰی اس طرح سے کیا یا نہیں جیسے کہ انھیں یہودیوں کی قومی روایتوں اور پیشین گوئیوں کے مطابق کرنا چاہیے تھا لیکن اگر وہ کرتے تو ان کی شخصیت کو دیکھتے ہوئے انھیں اس کا حق تھا۔

ان کے یہودی پیروں کے دلوں اور عقب۔ دل کو اسی مسیحائی اور شہنشاہی کی امید نے مضبوط کیا تھا اور جب انجام کچھ اور ہوا تو وہ بوکھلا گئے، اور انجیل کی روایت ہے کہ ان کے سب سے بڑے چیلے نے ایک موقع پر ان کے پیرو ہونے سے انکار کر دیا۔ حضرت عیسیٰ کا پیغام جن لوگوں نے سب سے پہلے سنا وہ غریب اور مصیبت زدہ تھے، عیسائی مذہب شروع میں ہر جگہ نیچے سے اوپر کی طرف پھیلا، غریبوں سے امیروں، محکوموں سے حاکموں، مظلوموں سے ظالموں تک پہنچا اور اس پر مسکینی اور مظلومیت کا ایک رنگ چڑھ گیا جو حضرت عیسیٰ کی سی شخصیت کی حوصلہ مندی اور خودداری سے نبھایا نہیں جا سکتا۔ چونکہ نادار اور محتاج، جن کی عمر دکھ سہتے اور مصیبت جھیلتے گذرتی تھی حضرت عیسیٰ کی تعلیم کا پرچار کرتے تھے، ان لوگوں کی زندگی سچی عیسائی زندگی کا نمونہ سمجھی گئی اور دین اور دنیا کے درمیان ایک غیریت پیدا ہو گئی جو حضرت عیسیٰ کی اصل تعلیم میں نہیں تھی۔ گوتم بدھ کی طرح حضرت عیسیٰ نے انسان کی نیت کو زندگی کی آگ میں جل کر کھوٹ سے پاک ہونا سکھایا، خاک میں مل کر اور آسمان کی سیر کر کے ذات اور نسل، دولت اور افلاس، رنج اور راحت، کامیابی اور ناکامی کو حقیر اور ذلیل سمجھنے کی تدبیر بتائی، انسان کو ادنیٰ نعمتوں کی غلامی سے آزاد کر کے اسے یہ عظیم الشان حوصلہ دلایا کہ خدا کے اوصاف کا اسی طرح ایک نمونہ بن جائے جیسے ذرہ آفتاب کا ہوتا ہے۔ گوتم بدھ کی طرح حضرت عیسیٰ نے بھی ایسوں کو اپنے

سائے میں پناہ دی جنھیں دنیا ناپاک جان کر ذلت اور حقارت کے کیچڑ میں نہلاتی تھی اور انھیں دیکھ کر اپنا منہ پھیر لیتی تھی حضرت عیسیٰ نے ایسوں کو پناہ ہی نہیں دی بلکہ ان کی ندامت کو خدا کی نظروں میں اس قانون پرستی سے بدرجہا بہتر ٹھیرایا جو تنگ نظری یا خود پسندی پیدا کرے۔ حضرت عیسیٰ اور گوتم بدھ کی تعلیم میں فرق تھا تو بس اتنا کہ گوتم بدھ نے اپنی شخصیت کی مثال پیش کرنے کے سوا انسان کو بے مدد چھوڑ دیا تھا، اور حضرت عیسیٰ نے اسے خدا کی ذات اور اس کی رحمت کا بڑا سہارا دیا، ایسا سہارا جو یہودیوں کو نصیب نہ تھا، حالانکہ وہ اسی خدا کو مانتے تھے، یہودیوں کے قومی مزاج میں لاچاری کا جو غصہ تھا اور پیغمبروں نے انھیں سیدھے رستے پر لانے کے لئے عذاب سے جس طرح ڈرایا تھا اس کا مجموعی اثر یہ ہوا تھا کہ ان کے عقیدے میں خدا کا انصاف اس کے رحم پر غالب آگیا' وہ ایسے قانون پرست اور لکیر کے فقیر ہوگئے کہ انھوں نے ایک مرتبہ بیت المقدس کو فتح ہوجانے دیا' صرف اس لئے کہ دشمن نے ہفتے کے دن حملہ کیا تھا اور اس روز کاروبار بند رکھنے اور عبادت میں مصروف رہنے کا حکم تھا۔ حضرت عیسیٰ نے لوگوں کے دلوں سے سزا کے خوف کو نکال دیا، انھیں سمجھا دیا کہ خدا کا انصاف قانونی انصاف نہیں' ان کی تعلیم میں ہم اعمال کا کوئی ایسا حساب کتاب نہیں دیکھتے جیسا کہ آریہ فلسفیوں اور بدھ متیوں کے یہاں کرم اور آواگون کے عقیدوں

میں ظاہر ہوتا ہے۔ حضرت عیسیٰ کی نظر عیب یا قصور پر نہیں تھی، وہ آگے کی طرف اور بلندیوں پر اپنی نگاہ جمائے ہوئے تھے، وہ اس دنیا کو اس زندگی کو بیچ سمجھتے تھے ایک امکانی زندگی کے مقابلے میں، جسے وہ حکومت الٰہی کہتے تھے، ایک ایسی زندگی جس میں انسان کا ارادہ خدا کی مرضی میں گم ہو جائے، جب انسان نیک اور بد کی تمیز سے گذر جائے، اور دنیا کو اسی طرح فیض پہنچائے جیسے قدرت کا وہ انتظام کہ جس کی بدولت اچھے اور برے دونوں کے لئے سورج چمکتا ہے، ہوا چلتی ہے، یا پانی برستا ہے۔ لیکن اس نئی زندگی کے لئے میدان صاف کرنے کی ضرورت تھی، انسان کو ایک نیا جنم لینا ضروری تھا کہ اس میں بچوں کی سی معصومیت اور فرشتوں کی سی دانائی پیدا ہو، دنیا کے پرانے نظام کو درہم برہم کر کے ایک نیا نظام قایم کرنا تھا جس میں وہ سب سے بڑا ہو جو اپنے کو سب سے چھوٹا جانے سب پر حکومت وہ کرے جو خود کو سب کا غلام مانتا ہو۔

یعنی حضرت عیسیٰ اپنی تعلیم کے ذریعے سے ایک بہت بڑے دینی اور دنیاوی انقلاب کا سامان کر رہے تھے اور اسی کے ڈر میں یہودیوں کے مذہبی رہنماؤں نے مل کر ایسے وقت ان کی زبان بند کر دی جب کہ وہ پوری بات کہہ بھی نہ پائے تھے۔ ان کی شخصیت اور ان کی تعلیم اتنا اثر تو دکھا چکی تھی کہ زخمی دلوں کا مرہم بن جائے اور پامال آرزوؤں کو سرسبز ہونے کی امید دلائے۔ لیکن

وہ حقیقت کا رنگ روپ اختیار کرنے نہیں پائی تھی کہ ایک افسانہ بن گئی اور ان چند باتوں پر جو لوگوں کے ذہن نشین ہو گئی تھیں اور چند واقعات پر جو انھوں نے دیکھے اور سنے تھے ایک ایسا مذہب اور معاشرتی قانون بنا کر کھڑا کرنا بہت ہی مشکل تھا جو حضرت عیسیٰ کی خواہش اور ارادے کے بالکل مطابق ہوتا۔ سینٹ پول، جنھوں نے عیسائی مذہب کے پرچار میں سب سے زیادہ کام کیا، اور جنھیں عیسائی ملت کے نظام کا بانی سمجھنا چاہیئے حضرت عیسیٰ کی صحبت کیا دیدار کا بھی شرف حاصل نہ کر سکے تھے، وہ اس وقت کے تمام مذہبوں کا مطالعہ کر چکے تھے اور وہ جب عیسائی ہوئے تو ان کے اس پرانے علم نے ان کے نئے عقیدے کو اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ ان میں صداقت تھی اور جوش تھا مگر نئی ملت کو ہدایت دینے اور اس کے لئے قانون بنانے کا جو فرض انھیں ادا کرنا پڑا وہ دراصل خود حضرت عیسیٰ کے سوا اور کوئی انجام نہ دے سکتا تھا۔ پھر سینٹ پول کو بھی اتنی مہلت نہ ملی کہ وہ اپنا کام ختم کریں اور جب یہ نیا مذہب علم اور تہذیب کے پرانے مرکزوں، ایتھنز، اسکندریہ اور روم میں پہنچا تو اسے ایسا لباس اور ایسی وضع اختیار کرنا پڑی جس میں اس کی صورت پہچاننا بہت مشکل تھا۔ دیوتاؤں کا انسانوں کے روپ میں جنم لینا پرانے مذہبوں کی دیومالا میں ایک معمولی واقعہ تھا، لیکن حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا اور اس کا اوتار بنا دینا جب کہ خود انھوں نے

کبھی اس کا دعویٰ نہ کیا تھا ایک زبردستی کی عزت افزائی تھی جس سے ان کی شخصیت پردے میں چھپا دی گئی اور یہ بھید سمجھانے کے لئے کہ وہ مسیح جن سے اتنی امیدیں بندھی ہوئی تھیں، جن کے متعلق پیشین گوئی کی گئی تھی کہ وہ یہودیوں کے بادشاہ ہوں گے اور ان کے ذریعے سے خدا اپنے انصاف کا نظارہ دکھائے گا، وہ مسیح ناکامیاب کیوں کر ہوئے ان کی زندگی اور اس کے انجام کو تمام انسانوں کے گناہوں کا کفارہ سمجھنا ایک ایسی تشریح تھی جس کی حضرت عیسیٰ کی تعلیم میں کوئی سند نہیں ملتی ہیں اس سے مطلب نہیں کہ حضرت عیسیٰ کے اوتار ہونے کا عقیدہ کس قوم کی دیومالا سے لیا گیا، تثلیث یعنی خدا، عیسیٰ اور روح القدس کے تین اور ایک ہونے کا خیال مصری تثلیث السیس، اوسی رس، ہورس کا جواب ہے یا ایک عقیدہ جو آپ ہی آپ پیدا ہو گیا، لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شروع سے عیسائیوں میں ہر عقیدے کے لوگ تھے، بعض حضرت عیسیٰ کو خدا مانتے تھے تو بعض انھیں خدا کا ایک معمولی بندہ سمجھتے تھے جسے پیغمبری کا مرتبہ عطا کیا گیا بعض ان کی زندگی اور اس کے انجام کو نوع انسانی کے گناہوں کا کفارہ سمجھتے تھے تو بعض اسے خالص ایثار اور خدمت کی بہترین مثال مانتے تھے۔ ان اختلافات اور ان بحثوں نے جو انھیں مٹانے کے لئے کی گئیں لوگوں کی نظروں کو اصل چیز سے ہٹا دیا، ایثار اور خدمت کا جذبہ تو اس طرح ابھر چکا تھا کہ اب اس کا دبانا مشکل تھا،

مگر حکومت کی جو صورت کلیسا نے اختیار کی اور دیندار اور دنیادار کا جو فرق دوسروں کی دیکھا دیکھی پیدا کیا گیا اس نے بہت کچھ کام بگاڑا اور وہ ذہنی اور معاشرتی انقلاب جو حضرت عیسیٰ دل میں ٹھانے ہوئے تھے ایک سراب کی طرح ہمیشہ دور ہی سے نظر کو لبھاتا اور شوق کو دھوکا دیتا رہا۔

(۹)

اسلام

گوتم بدھ کی تعلیم چین، تبت اور مشرقی ایشیا کی خانقاہوں میں تیاگی بن کر بیٹھ رہی تھی، حضرت عیسیٰ کی تعلیم چھ سو برس تک مغربی دنیا میں سر مار چکی تھی اور اس کے پیرووں کے جھگڑے اس کی جگ ہنسائی کرا رہے تھے، پرانے دیوتا بُت بن کر رہ گئے تھے، اور ان کے ماننے والے زندگی اور اس کے کٹھن دھندوں سے الگ ہو کر فلسفے کی شانتی اور بے چارگی میں پناہ لے رہے تھے. سیاسی دنیا میں بھی ایسی ہی ابتری تھی، ادھر ہندوستان کی گپت تہذیب کو، ادھر روم کی شاندار سلطنت کو وحشی نسلوں نے تباہ کر دیا تھا، چین میں ریاست اور تہذیب دونوں ترقی پر تھیں مگر اپنے الگ کونے میں، ایران میں ساسانی خاندان نے ایک

خاصی بڑی سلطنت قائم کی تھی، مگر وہ روم کی مشرقی سلطنت سے جس کا مرکز قسطنطنیہ تھا، ٹکرا ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ چکی تھی، اس میں کچھ رونق تو تھی مگر جان نہ تھی، اور بادشاہوں کی بے لگامی اور مذہبی رہنماؤں کے فساد نے اس کو اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب رومی اور ایرانی شہنشاہوں کے دربار میں عرب سے سفیر آئے جو دیکھنے میں غریب گڈریے معلوم ہوتے تھے اور انھوں نے ان بادشاہوں کو اسلام قبول کرنے یعنی خدا کو ایک اور محمد کو اس کا رسول ماننے کی دعوت دی۔

اسلام ایک لمبے سلسلے کی آخری کڑی ہے، وہ اپنے آپ کو اتنا ہی پرانا بتاتا ہے جتنا کہ آدمی اور اس کی انسانیت، اور اتنا ہی تازہ جتنی کہ آج کی امنگیں، وہ اپنا رشتہ ہر قوم سے اور ہر قوم کے دینی رہنماؤں سے جوڑتا ہے، انسان کی فطرت اور اس کی عقل اسلام کی زمین ہے، انسان کا دل اور اس کے حوصلے اسلام کا آسمان، اس کی نظر کسی ایک زمانے، کسی ایک حالت پر نہیں ہے بلکہ پیچھے اور آگے کے ہر زمانے اور ہر حالت پر، وہ الگ الگ آدمیوں ہی کا نہیں، قوموں اور سماجوں کا مذہب ہے، اور الگ الگ سماجوں ہی کا نہیں، پوری انسانی جماعت کا مذہب ہے۔

اسلام نے تاریخ سے قوت بھی حاصل کی اور سبق بھی لیا، اور یہی وجہ ہے کہ ہم اس میں نہ وہ انتہا پسندی دیکھتے ہیں جو انسانی زندگی کو کاٹ کر دین اور دنیا کے نام سے دو ٹکڑے کر دیتی ہے اور جذبہ دینی کو شخصی مذاق اور رجحان کی سوکھی روٹی پر پالتی ہے،

نہ روحانیت سے وہ بدگمانی پاتے ہیں جو عقل اور تجربے کے سوا ہدایت کے اور تمام ذریعوں کو چھوڑنے سے ترقی کے ہر رستے کو ایک بند گلی بنالیتی ہے۔

اسلام نے خدا کو ایک ماننے کا حکم دیا۔ یہودی بھی خدا کو ایک مانتے تھے لیکن وہ اسے خاص اپنا خدا مانتے تھے، جیسے کوئی اپنے باپ کو اپنا ہی باپ سمجھتا ہے، چاہے وہ اسے ڈانٹتا رہے اور غیروں کے ساتھ ضد میں کبھی کوئی سلوک بھی کر دے۔ حضرت عیسیٰ نے خدا کے رحم و کرم اور اس کی خاص مہربانیوں کو نسل اور قوم کی قید سے چھڑا دیا، مگر عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ اور روح القدس کو خدا کی خدائی میں شریک کر کے اپنے سر میں درد پیدا کیا اور اپنی سماج میں تفرقہ ڈال دیا۔ اسلام نے پھر اس الجھاؤ کو سلجھا دیا، خدا کو ایک ٹھہرایا، اس کے اوصاف کو جہاں تک ہو سکا بیان کر دیا، مگر اس طرح کہ وہ خدائی کی مختلف شکلیں ہوں، خدا کی مختلف صورتیں نہ ہوں، اور انھیں اس طرح ملا دیا کہ انسان اپنی ہر حالت اور کیفیت میں خدا کی قدرت دیکھ سکے، مگر خدا کی ذات کو ایک خاص شکل دے کر اسے بت نہ بنا سکے۔ اسلام میں خدا کا جو تصور ہے اس میں آریہ رشیوں کے پرماتمن، زرتشتیوں کے اہرمزد، یہودیوں کے یاہ وہ یا الوہیم، یونانیوں کے لوگوس اور عیسائیوں کے رب کا تصور شامل ہے، اور یہ ہونا بھی چاہئے تھا کہ انسان نے جب بھی دیکھا اور جہاں بھی دیکھا اسی ایک خدا کو دیکھا۔

اسلام کا دوسرا عقیدہ، کہ محمدؐ کو خدا کا رسول مانو مذہبی زندگی کا ایک نیا سلسلہ شروع کرنے کے لئے انسان کی تاریخ کو کہیں سے توڑتا نہیں بلکہ جہاں کہیں وہ ٹوٹی ہوا ہے جوڑتا ہے۔ مسلمان کو ماننا چاہئے کہ ہر قوم کے پاس خدا کی طرف سے دینی اور دنیاوی ترقی کا صحیح رستہ بتانے والے رہنما بھیجے گئے، قوموں نے ان کی باتیں سمجھیں نہیں یا ان سے منہ پھیرا، اس لئے ان کے پاس اور رہنما بھیجے گئے یا انھوں نے اپنی گمراہی کی سزا بھگتی۔ گویا اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا ایک مدرسہ ہے جس میں پیغمبر استادوں کی جگہ ہیں، کوئی استاد یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے سوا کسی نے کچھ پڑھایا نہیں اور کوئی لڑکا یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے فلاں استاد یا اس مضمون سے جو وہ پڑھاتا ہے کوئی مطلب نہیں۔ اسلام کا یہ عقیدہ کہ وہ پیغمبر جنھوں نے اس کو دنیا میں پھیلایا آخری پیغمبر تھے بس یہ جتاتا ہے کہ نوع انسانی کو اس کا آخری سبق پڑھایا جاچکا ہے، ایک مکمل سبق کہ جس کے بعد اسے سمجھنا چاہئے وہ اپنی تعلیم سے فارغ ہو گئی، اب اسے مدرسے کے باہر نکل کر اپنے استادوں کا اور اس کا جس نے مدرسہ بنایا حق ادا کرنا اور دنیا میں اپنا جوہر دکھانا چاہئے۔

اسلام کا تیسرا عقیدہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام پر قرآن نازل ہوا، جو الہامی علم کا آخری اور مکمل نمونہ ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ بھی ہے کہ اور قوموں کے ہادیوں کو بھی الہامی علم نصیب ہوا ہے یعنی یہ علم نوع انسانی کی ہدایت کا ایک مستقل ذریعہ ہے، اس میں

ور دنیاوی علم میں فرق یہ ہے کہ دنیاوی علم تجربے سے حاصل ہوتا ہے، اس کی بنیاد شک پر ہے اور ہمارے حواس اس کو محدود رکھتے ہیں۔ الہامی علم واردات قلبی کا نتیجہ ہے، اس کی بنیاد یقین پر ہے، ہمارے حواس اس کے بندے ہیں اور اس کی رہنمائی کے بغیر انسان کی آنکھ بے نور اور عقل بے شعور رہتی ہے۔

خدا، رسول اور الہام کی حقیقت کے سوا اسلام کی تعلیم میں باقی جو کچھ ہے وہ انصاف میں سمویا ہوا علم اور تجربہ ہے۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ اسلام نے اس علم اور تجربے کو مذہبی رسم اور قانون کی ظاہری شکل دیدی، اپنا مطالبہ کم سے کم رکھا اور انسان کو اپنی فطرت اور زمانے کی ضروریات کا لحاظ رکھنے کی زیادہ سے زیادہ آزادی دیدی، تاکہ رسم اور قانون کسی آئندہ زمانے کی زندگی اور اس کے فرائض کے خلاف نہ پڑ جائیں۔ گوتم بدھ اور حضرت عیسیٰ نے آدمی آدمی کو برابر اور ایک کو دوسرے کا بھائی ٹھہرایا تھا، لیکن ایسی کوئی رسم قایم نہیں کی جو ان کی تعلیم کو لوگوں کے دلوں میں تازہ رکھے۔ اسلام نے ایک طرف جماعت کی نماز اور دوسری طرف زکوٰۃ کا قاعدہ بنا کر مساوات اور بھائی چارے کو ایک رسمی اور قانونی شکل دیدی۔ اگر غریب امیر، دیسی پردیسی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں تو اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ وہ خدا کے سامنے مل جل کر کھڑے ہوں اور اپنی مسجد میں پریم کے دیے سے اجالا کریں۔ لیکن اگر ان کے دل ایک دوسرے

سے پھر گئے ہوں، جیسے کہ آجکل ہندوستان میں تو یہ کیا کم ہے کہ وہ کبھی کبھی ایسی جگہ پر مل جائیں جہاں ان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا اور وہ سب خدا کے بندے ہو جاتے ہیں - ایسے ہی زکوٰۃ بھی باہمی امداد اور بھائی چارے کی ایک آسان صورت ہے، کہ ہر شخص جس کے پاس سرمایہ ہو اپنی دولت کا تھوڑا سا حصہ نکال کر بیوہ عورتوں، یتیم بچوں اور مصیبت زدہ بھائیوں کی مدد کرے ۔ جماعت کو تو بہت زیادہ اختیار رہے، کہ اسلام نے دولت کو امانت قرار دیا ہے، اور جماعت جب چاہے اس دولت کو واپس لے سکتی ہے، یا اسے نئے سرے سے تقسیم کر سکتی ہے، لیکن اگر جماعت اس اختیار سے فائدہ نہ اٹھائے تب بھی زکات سے ہزاروں کا کام بن سکتا ہے ۔ اسلام نے یہ بتا دیا ہے کہ کم سے کم کیا ہونا چاہئے، آگے جیسی آدمی کو توفیق ہو ۔ دنیا اسے دیدی گئی ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے ۔

اسلام نے عورت کو جو حیثیت دی ہے وہ اسی زمانے میں نہیں جب کہ عورت اور پالتو جانوروں میں فرق نہ تھا بلکہ آج کے لئے بھی روشن خیال قانون سازی کا ایک مثالی نمونہ ہے ۔

گوتم بدھ نے عورتوں کو سنگھ میں مردوں کے برابر جگہ دی تھی، مگر دنیاوی زندگی میں ان کا جو حق تھا وہ انھیں نہیں دیا ۔ حضرت عیسیٰ ایسا کوئی سنگھ بھی نہ بنا سکے، اور بعد کو جب عیسائی مذہب نے دین اور دنیا کو الگ کیا اور خاندانی

زندگی بھی بے آبرو ہو گئی تو عورت گناہ کی جڑ اور شیطان کی یار وفادار بن گئی
اسلام نے عورت کو کچھ باپ اور کچھ شوہر کی دولت سے دلا کر محتاج رہنے سے
بچایا، نکاح کے لیے رضامندی کی شرط رکھی، اور اسے ایک قانونی معاہدہ بنا کر
عورت کو یہاں تک اختیار دیدیا کہ چاہے تو اس معاہدے کو توڑنے کا حق شوہر سے
تسلیم کرالے۔ مرد کو چار شادیاں تک کرنے کی اجازت دینا دراصل ہوس اور زیادتی
کو قابو میں کرنے اور خاندان کی صورت بنائے رکھنے کی ایک کوشش ہے۔ یہ
اجازت کوئی حق نہیں ہے، اور اس کے ساتھ ایسی شرطیں لگی ہیں کہ جماعت جب
چاہے ایک سے زیادہ شادی کرنے کی ممانعت کر سکتی ہے، اور جماعت نہ
کرے تو عورتیں اپنے نکاح ناموں کے ذریعے خود کر سکتی ہیں۔ ہندوستان میں
پردے کی جو رسم قایم ہوئی اس کے لئے اسلامی قانون میں کوئی سند نہیں۔ اسلام
نے عورت کے لیے جو پابندیاں رکھی ہیں وہ خالص اخلاقی ہیں، اور ان کا مقصد
خاندانی زندگی کی سلامتی کے آگے اور کچھ نہیں۔

عورت کی طرح غلام کو بھی اسلام نے اپنی مساوات اور بھائی چارے کی تعلیم
سے فیض پہنچایا۔ غلامی پرانے زمانے کی زندگی کا ایک بدنما دھبا ہے، جیسے
آج کل کسان اور مزدور کی جو حالت ہے وہ ہمارے زمانے کی صورت بگاڑے ہوئے
ہے۔ غلامی کا اس وقت مٹا دینا اتنا ہی مشکل تھا جیسا کہ آج کل صنعت کو مزدوروں

کے بغیر قایم رکھنا۔ اسلام نے جو زیادہ سے زیادہ کیا جا سکتا تھا وہ کیا، آقا اور غلام کا مرتبہ خدا کے سامنے بالکل برابر، اور آدمیوں میں قریب قریب برابر کر دیا، آقا کو حکم دیا کہ جو خود کھاؤ وہ غلام کو کھلاؤ، جو خود پہنو اسے بھی پہناؤ، غلام کو آزاد کرنا نیک کام ٹھہرایا اور غلام کو حق دیا کہ ایک آقا سے نہ بنے تو اپنے آپ کو کسی دوسرے کے ہاتھ بکوا لے۔ مسلمانوں میں بے شک ہزاروں لاکھوں غلام ایسے ہوں گے جن پر ان کے آقاؤں نے ظلم کیا، ہزاروں لاکھوں ایسے بھی ہوں گے جو اچھی طرح سے رکھے گئے، اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ غلاموں نے بڑی حیثیت بھی پائی، سپہ سالار ہوئے، حاکم ہوئے، بادشاہ ہوئے، اور جو لوگ آزاد پیدا ہوئے ان کو مجال نہ تھی کہ انھیں کسی اعتبار سے اپنے سے کم ٹھہرائیں۔

انسان کی طبیعت بڑی ہی منچلی، سدا پلٹے کھانے والی اور منہ زور ہوتی ہے اسے نہ خود قرار ہے نہ دوسرے پر اعتبار، وہ ہر تدبیر کو الٹ دیتی ہے، ہر تعلیم کو پلٹ دیتی ہے، کبھی وہ پستی کی گہرائیوں میں اپنا ٹھکانا کرتی ہے، کبھی اپنا سر آسمان سے بھی اونچا اٹھانا چاہتی ہے، کبھی اسے غلامی میں آرام ملتا ہے، کبھی پابندیوں کے خیال سے بھی اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اسلام نے انسانی فطرت اور اس کی اونچ نیچ کے لئے زیادہ سے زیادہ گنجائش رکھی ہے، خود غرضی اور تنگ دلی ہوس پرستی اور بے پروائی کے لئے ایک حد مقرر کی ہے، لیکن تمام آدمیوں کی

طبیعت اور مذاق کو روحانیت کے کسی ایک سانچے میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کی ہے، اس لئے کہ آدمی کو ایسے سانچے کبھی کبھی پسند بھی آجاتے ہوں تو وہ بعد کو ان سے گھبرا جاتا ہے اور انھیں اس طرح توڑ مروڑ کر پھینک دیتا ہے جیسے بچے پرانے کھلونوں کو۔

اسلام نے پرانے خالص روحانی شخصیت کے نمونے کو چھوڑ کر آدمیت کا ایک نیا خاکہ بنایا، جو کبھی بھر دیا جائے تو کامل انسان کا نمونہ بن جاتا ہے۔ یہ نمونہ بانی اسلام کی شخصیت میں موجود ہے، اور اگرچہ پیغمبری کا مرتبہ انھیں کا حصہ تھا اسلام نے سچی آدمیت کی جو نشانیاں بتائی ہیں ان کا قدرت کی طرف سے خاص طور پر عطا ہونا ضروری نہیں، وہ سب انسانی فطرت میں موجود ہیں۔ اسلام نے اس تنگ نظری کو ایک قید خانہ ٹھہرایا ہے جو ذات قوم اور نسل کے فرق کو ماننے سے پیدا ہوتی ہے، اس روحانیت کو بے کار سمجھا ہے جو آدمی کی اپنی شخصیت میں رہے اور جماعت تک نہ پہنچائی جا سکے۔ اسلام نے آدمی کو دنیا کی تمام نعمتوں کا حقدار مانا ہے، مگر اعتدال پر بھی زور دیا ہے کہ یہ نعمتیں آدمی کو اپنا غلام نہ بنا لیں۔ علم حاصل کرنا، دنیا کی قدرتی دولت سے فائدہ اٹھانا اور زندگی کو ہر ممکن طریقے سے بہتر بنانا، یہ بھی ایسے کام ہیں جنھیں اسلام نے آدمیت کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ اور یہ سب ہے اس لئے کہ اسلام نے سمجھے ایک ہی سانس میں انسان

کو خدا کا بندہ بھی کہا ہے اور اسے دنیا کا بادشاہ بھی بنایا ہے، ایک ایسا بادشاہ کہ جس کی شان فقیری میں ہے اور جس کی حکومت خدمت اور ایثار سے مستحکم و مضبوط ہوتی ہے۔

محمدؐ کا گیت

(جرمن شاعر گوئٹے کی نعتیہ نظم)

اس چشمے کو دیکھو، جو ستاروں کی کرنوں کی طرح ہنستا ہوا، صاف شفاف چٹانوں میں سے نکلا۔ بچپن میں اسے قدسیوں نے اس دنیا میں پالا جو بادلوں سے پرے ہے، شباب کی تازگی اور جوش لئے ہوئے وہ ایک خرام ناز کے ساتھ بادلوں سے نکلتا ہے اور چٹانوں کے بیچ میں سے جھاڑیوں سے گذر کر مرمریں چٹانوں پر گرتا ہے اور پھر مسرت کے نعرے لگاتا ہوا آسمان کی طرف اچھلتا ہے۔

وہ چوٹیوں کے درمیان دروں میں سے ایک رنگین پتھر سے دوسرے کی طرف لپکتا ہے۔ اس کے قدم کو شروع ہی سے رہنمائی کی صفت عطا ہوئی ہے

اور وہ اپنے بھائی بندوں کو اپنے ساتھ بہا کر لیجاتا ہے۔

نیچے وادی میں جہاں اس کا قدم پڑتا ہے پھول کھلنے لگتے ہیں اور اس کے دم سے سبزہ زار میں جان پڑ جاتی ہے۔ لیکن اسے نہ سایہ دار وادی روک سکتی ہے نہ وہ پھول جو اس کے گھٹنوں سے لپٹ لپٹ کر محبت بھری آنکھوں سے اس کی خوشامد کرتے ہیں۔ اس کا بہاؤ اسے میدان کی طرف چکر دیتا ہوا لیجاتا ہے۔

چھوٹے چشمے اس کے دامن سے لپٹ کر چلتے ہیں۔ اب وہ چاندی کی طرح چمکتا ہوا میدان میں پہنچتا ہے اور میدان بھی اس کی آب و تاب سے چمک اٹھتا ہے۔ اب میدان کے دریا اور پہاڑوں کے چشمے پکار پکار کر کہتے ہیں: "بھائی، اے بھائی، ہمیں بھی اپنے رب کے پاس لئے چل! ہمیں بھی بے پایاں سمندر کی گود میں پہنچا دے۔ وہ ہمارے انتظار میں ہاتھ پھیلائے ہے اور افسوس ہم اس کے مشتاق اس کی گود تک پہنچ نہیں پاتے۔ ہمیں ریگستانوں کی پیاسی ریت سوکھے لیتی ہے، اوپر سے سورج ہمارا خون چوسے لیتا ہے، کوئی پہاڑی رستہ روک کر ہمیں تالاب بنا دیتی ہے! اے بھائی، اپنے میدان والے بھائیوں کو، اپنے پہاڑ والے بھائیوں کو اپنے ساتھ اپنے رب کے پاس لئے چل!"

"آؤ، سب آؤ!" اب وہ بڑی شان سے موجیں مارتا بڑھتا ہے ساری قوم اپنے بادشاہ کو کندھوں پر اٹھائے ہوئے چلتی ہے اور فتح کے ریلے

میں وہ ملکوں پر اپنا سکہ بٹھاتا جاتا ہے۔ جہاں اس کا پیر پڑتا ہے شہر آباد ہو جاتے ہیں۔

اس کا بہاؤ کسی کے روکے نہیں رُکتا، وہ زور شور سے میناروں کی چمکتی چوٹیوں، مرمریں عمارتوں کو پیچھے چھوڑ کر تخلیق کے جوش میں آگے بڑھا چلا جاتا ہے، گویا اطلس ایک دنیا کو کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔ اس کے سر پر ہزاروں جھنڈے لہراتے اور سرسراتے ہیں اور یہ سب اس کی شان و شوکت کے نشان ہیں۔

اس طرح وہ اپنے بھائیوں، اپنے عزیزوں، اپنے بچوں کو ان کے رب کے پاس، جو ان کے انتظار میں تھا، پہنچا دیتا ہے اور وہ انھیں مسرت کے جوش میں گلے لگا لیتا ہے۔

(۱۰)

مسلمانوں کی سیاست

حضرت عیسیٰ کی پہیلیوں میں سے ایک پہیلی ہے کہ بونے والے نے بیج بوئے، ان میں سے بعض پتھریلی زمین میں گرے اور پڑے پڑے خراب گئے، بعض کانٹوں میں گرے، اور وہ جمے تو سہی مگر کانٹوں نے پودوں کی باڑھ ماردی، بعض ایسے تھے جو اچھی زمین میں گرے، وہ جمے اور بڑھے اور انھوں نے پھول اور پھل دیے۔ پیغمبرِ اسلام نے زمین میں بیج ہی نہیں بکھیرے، کسان کی طرح اپنی کھیتی کی فکر بھی کی، اور زندگی کے کاروبار میں قدرت کے دیے ہوئے سرمایے اور انسان کی محنت دونوں کو حساب سے لگایا۔ لیکن آدمی کی طبیعت، اس کی نیت اور اس کا ارادہ خود اس کے قابو میں کہاں ہوتا ہے جو وہ اسے کسی تعلیم اور ہدایت کا بالکل پابند کر سکے۔ مسلمانوں کی تاریخ

روز افزوں دینداری کی داستان نہیں ہے، ہم اس میں دیکھتے ہیں کہ مسلمان کبھی اسلام کے قایم کیے ہوئے معیار کے قریب آئے اور کبھی اس سے دور ہٹے، اسلام کی تعلیم پر کبھی ملک اور زمانے نے اپنا رنگ چڑھایا، کبھی وہ خود وقت اور مقام کی قید سے آزاد ہوئی اور مسلمانوں کو آزاد کرنے لگی، سیاست اور مصلحت نے کبھی اسے نظر انداز کیا، کبھی وہ سیاست کی جان سمجھی گئی اور مصلحت اس پر قربان ہوئی، کبھی مسلمانوں نے اسے اپنی چیز بنا کر رکھا اور کبھی وہ زندگی میں گھل مل کر نوع انسانی کا عام ورثہ بھی بن گئی۔ زندگی کے اتار چڑھاؤ نے اکثر مذہبوں کی اس طرح کایا پلٹ دی کہ اب ان کی اصل صورت پہچانی نہیں جاتی، اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی روشنی کو جہالت اور ذہنی بگاڑ بس اتنا ہی ماند کر سکا جتنا کہ بادل سورج کو، اور اس کی کرنیں کالی سے کالی گھٹاؤں میں سے بھی پھوٹ پھوٹ کر نکلتی رہیں۔

اسلام نے دین اور دنیا، عبادت اور عادت کو اس طرح شیر و شکر کر دیا کہ اسلام کی تاریخ مسلمانوں کی تاریخ سے الگ نہیں کی جا سکتی۔ اسلام یا مسلمانوں نام لیجئے تو ملک گیری کے حوصلے، علمی خدمات، تجارت اور تہذیب، قانون اور اخلاق، غرض زندگی کا ہر پہلو اور ترقی کا ہر میدان نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ غیر مسلموں کو یہ عجیب معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اپنے مذہب کو دنیا اور تاریخ

کی آلائشوں سے پاک نہیں کرنا چاہتے، بعض مسلمان اس پر شرماتے ہیں کہ ان کی ہر لڑائی جہاد اور ہر سیاسی کارروائی شرعی مسئلہ مانی گئی ہے۔ لیکن جہاں اسلام کی تعلیم ہے کہ دین اور دنیا، روح اور جسم، اخلاق اور تہذیب جدا نہیں نہ کئے جا سکتے ہیں وہاں دوسری طرف خود تاریخ کو دیکھئے تو وہ آدمی اور آدمیت کی کہانی ہے، روحانیت کا کرشمہ نہیں۔ دنیا کی حقیقتوں سے بیزار ہو کر فلسفے اور خالص روحانیت میں منہ چھپانا دراصل ساری انسانی تاریخ کو بے معنی اور بے مصرف ٹھیرانا ہے۔ مگر اپنی آنکھ بند کر لینے سے ہم تاریخ کی روشنی کو بجھا نہیں سکتے، اس کے اثر کو زائل نہیں کر سکتے۔ تاریخ کا جو معیار ہے وہ قائم رہے گا، کہ سچا ہنر وہ ہے جو عیب کا مقابلہ کرے، ترقی کے محرک وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی پرائی خامیوں اور غلطیوں کے باوجود دنیا کو اس سے بہتر چھوڑا جیسا کہ انھوں نے اسے پایا تھا۔

اسلامی سیاست کی بنیاد مذہب کے ساتھ رکھی گئی، پیغمبر اسلام کے زمانے ہی میں آباد دنیا کے سروں تک اسلام کی دعوت بھیجی گئی اور اسی زمانے میں ملت کا وہ تصور قائم ہوا جس نے ذات، قوم اور نسل کے فرق کو مٹایا، ہر مسلمان کو براہ راست شرع یعنی دینی قانون کے ماتحت کر دیا اور امتیازی حقوق کو رد کر کے مساوات اور بھائی چارے پر سیاسی انتظامات کی

عمارت کھڑی کی۔ اسی دینی مساوات کی سیاست میں ترجمانی کی گئی، ملت کو حکومت اور حکمت عملی کے تمام معاملات میں پورا اختیار دیا گیا کہ اپنے حاکموں کو چُنے، ان کے طرزِ عمل کو جانچے اور ان کو ہر وقت اپنی رائے اور خواہش سے آگاہ کرتی رہے۔ ادھر ملت بنی تو ادھر رواداری کو ایک سیاسی اور قانونی شکل دی گئی تاکہ غیر مذہب والے چاہیں تو آزادی اور آبرو کے ساتھ مسلمان حاکموں کی رعایا بن کر رہ سکیں۔ مسلمانوں کو جہاد اور شہادت کا بے شک شوق دلایا گیا، لیکن سپہ گری کو دوسرے پیشوں پر کوئی فضیلت نہیں دی گئی، بلکہ خدا کا دوست اسے کہا گیا جو محنت مشقت کر کے روزی کمائے اور سیاست کو ہنر اور صنعت کا ادب کرنا اور انھیں کی ترقی کو اپنی اصل کامیابی جاننا سکھایا گیا۔ اسی زمانے میں ذکات کا قانون بنا، جو ایک دینی فرض بھی تھا اور اس طرح محتاج اور مجبور، بیوہ اور یتیم کی خبر گیری کا ملت اور ریاست دونوں کو ذمہ دار بنایا گیا۔

اسلام کے پیدا کئے ہوئے حوصلے دل میں رکھ کر عرب اپنے گھروں میں بیٹھے نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کا دنیا میں پھیلنا لازمی تھا، اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایسی تیزی سے مغربی ایشیا، مصر اور بحرِ روم پر چھا گئے کہ جس کا تاریخ میں جواب نہیں۔ یہ کرشمہ ان کی تلوار نے نہ دکھایا اور نہ دکھا سکتی تھی۔ ان کی فوجیں اتنی

چھوٹی تھیں، ان کے پاس سرمایہ اور سامان اتنا کم تھا کہ اگر وہ اسی پر بھروسا کرتے تو اس وقت کی سلطنتیں انھیں انگلیوں میں مسل ڈالتیں۔ لیکن اسلام نے انھیں سیاست کے جو گر بتائے تھے انھوں نے ہر مشکل آسان کر دی، قلعوں کے دروازے کھول دئے، شہروں کی فصیلیں گرا دیں، دشمنوں کی ہمتیں بٹھا دیں اور مسلمانوں کے سائے کو یہ صفت بخشی کہ جہاں پڑے وہاں ویرانے کو بستی اور جنگل کو کھیت بنا دے۔ مسلمانوں کی سیاست نے اسلام کے لئے وہ کیا جو گوتم بدھ کی تعلیم کے لئے اشوک نے اور عیسائی مذہب کے لئے رومی شہنشاہوں کی سرپرستی نے۔ دراصل اسلامی سیاست ہی نے سب سے پہلے دنیا کی آنکھیں کھولیں، قوموں نے اسلام آہستہ آہستہ اکثر حاکموں کی مرضی کے خلاف قبول کیا۔ مسلمان فاتح کی تلوار بس ایک نشتر تھا جس نے دنیا کے بدن سے فاسد خون نکال کر تندرستی کا امکان پیدا کیا، مسلمانوں کو کامیاب نئی زندگی کے اس پیغام نے کیا جسے وہ ہر جگہ لے کر پہنچے تھے اور سلطنت انھیں انعام میں ملی۔

مسلمانوں کی ذمہ داریاں اور اختیارات اتنی تیزی کے ساتھ بڑھے کہ حکومت کا جو نظام شروع میں قائم ہوا تھا نئی ضروریات کے مطابق بدلا نہ جا سکا حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ ایسی شخصیتیں رکھتے تھے کہ ایک جوشیلی اور گرم



اسپین
مراکش
طرابلس
مصر
فارس
ترکستان
ہندستان
عرب
اسلامی دنیا ۷۵۰ء میں

مزاج قوم کے امنڈتے حوصلے بھی ان کے سامنے سر جھکائے رہے لیکن پھر وہ قابو سے نکل گئے۔ عرب سردار ابھی تک فرماں برداری کے عادی نہیں ہوئے تھے، ان کے دل پرانی عداوتوں سے پاک نہیں ہوئے تھے اور دنیا کی حکومت ایسی چیز نہیں ہے کہ دلوں کو ملائے۔ ایک اور بات یہ بھی تھی کہ عربوں پر شام، ایران اور قسطنطنیہ کی تہذیب کا فوراً اثر پڑنے لگا، اور وہ اس آن بان اور عیش آرام کو للچائی نظروں سے دیکھنے لگے جو مسلمانوں کی جماعت کے باہر ساری دنیا میں حاکم کا حق اور راج کا ٹیکا سمجھا جاتا تھا۔

اس طرح مسلمانوں میں دو خیال کے لوگ ہو گئے، ایک تو وہ تھے جن کے نزدیک حکومت کے فرائض کو ادا کرنا اور اسلامی سیاست کے ظاہری آداب برتنا کافی تھا، اور جو اپنی ذاتی زندگی کو اپنی چیز جان کر اسے جس طرح چاہتے بسر کرنے کا حق مانگتے تھے، دوسرے وہ لوگ تھے جو اسے لازمی ٹھہراتے تھے کہ مسلمانوں کے حاکم بہترین مسلمان بھی ہوں، اور ان کی ذاتی زندگی بھی اس نمونے پر ہو جو پیغمبر اسلام نے پیش کیا تھا۔ حضرت علی کے بعد پہلے خیال کے لوگ اسلامی ریاست کی قوت اور سرمائے پر قابض ہو گئے لیکن بے بسی میں بھی کھرے اور سچے مسلمان جو بادشاہی اور فقیری، حکومت اور خدمت، بڑائی اور خاکساری کے دو رنگ سے ایک تصویر بنانا چاہتے تھے ہمت نہیں ہارے، اور

امام حسین کی شہادت نے حق پرستی کی ایک مثال قائم کی جو اسلامی شہریت اور سیاسی اخلاق کی سب سے قیمتی یادگار رہے۔

مسلمانوں کی جو مرکزی حکومت حضرت علیؓ کے بعد قائم ہوئی اس میں خلیفہ کے انتخاب کی رسم رکھی گئی، لیکن تھی وہ اصل میں شاہی حکومت اور علاوہ ان جھگڑوں کے جو ہر نئے انتخاب کے وقت ہوتے تھے، عرب قبیلوں اور خاندانوں کی عداوتیں اور کینے اسے کمزور کرتے رہے۔ عربوں کی اس کوشش نے کہ فوج اور حکومت ان کے ہاتھ میں رہے، ماتحت قوموں کو ان کا اور ان کی سلطنت کا دشمن بنا دیا، عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ عربوں کا رویہ نہیں بدلا، انصاف اور رعایا پروری میں ان کی حکومت اپنے زمانے میں بے نظیر تھی، لیکن ان کی اپنی جماعت اندرونی فساد کے ہاتھوں تباہ ہوتی رہی عربوں نے انسانیت اور تہذیب کی جو خدمت کی اس کے مقابلے میں ان کی سیاسی ذہنیت اور انتشار پسند طبیعتوں کو دیکھئے تو حیرت ہوتی ہے، اور واقعی اگر ان کی حکومت کو اس ربط و اتحاد کا سہارا نہ ملتا جو اسلام نے پیدا کیا تھا تو شاید عرب اس دنیا کو جسے انھوں نے پچاس ساٹھ برس کے اندر حاصل کیا تھا دس پندرہ سال میں کھو بیٹھتے۔

ان عربوں کی سیاسی تہذیب، ان کی انسانیت اور رواداری کی

صورت ہمیں اس آگ کے پس منظر میں بہت صاف دکھائی دیتی ہے جو عیسائی ملت کے رہنماؤں نے گیارھویں صدی کے آخر میں لگائی، اور جو کوئی ڈیڑھ سو برس تک کبھی بجھتی کبھی بھڑکتی رہی۔ مسلمانوں کا قصور بس اس قدر تھا کہ وہ عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے درمیان صلح قائم رکھنا چاہتے تھے اور انھیں اس کا خیال نہ رہا کہ اور جذبات کی طرح جذبۂ دینی بھی اگر بہت زیادہ شدید ہو جائے اور عمل اس کے لئے کوئی رستہ نہ نکالے تو وہ سیلنے کو دیوانہ بنا دیتا ہے۔ بہر حال ان کے ظلم اور زیادتی کی داستانیں مغربی دنیا میں سنائی جانے لگیں، اور روم کے پاپا، جو بے لگام اور جنگجو بادشاہوں کو سیاسی میدان سے ہٹا کر اپنے اثر کو قائم کرنا چاہتے تھے، مختلف ملکوں کے بادشاہ جو اپنے فوجی سرداروں کی بے عنوانیوں سے عاجز تھے، عام سپاہی جن کے لئے لوٹ مار کا موقع کم ہو رہا تھا، عوام جو قرض دار ہو گئے تھے یا جن کے پاس کھانے کو نہ تھا، مرد، عورتیں بچے جن کے سر میں سودا یا پانو میں سنیچر تھا، سب بے دینوں کے خلاف لڑنے اور بیت المقدس کو ان کے قبضے سے نکالنے کے لئے اپنے گھروں سے چل کھڑے ہوئے۔ پہلی تین فوجیں جو صلیب کی آبرو بچانے کے لئے مشرق کی طرف روانہ ہوئیں فوجیں نہیں تھیں بلکہ بھوکے جانوروں کے غول، جو اپنے دیس سے نکلتے ہی سمجھے

کہ کافروں کا ملک آگیا ہے، اور اپنے عیسائی بھائیوں کے ساتھ اس طرح پیش آئے کہ ان میں سے ایک آدمی بھی زندہ نہیں چھوڑا گیا۔ چوتھی صلیبی فوج میں دیوانوں کے ساتھ تین لاکھ سپاہی بھی تھے، مسلمانوں کی قسمت نے اس وقت کچھ ایسا پلٹا کھایا تھا کہ آبادی اور آدمیت کے یہ دشمن کہیں پر روکے نہ جاسکے، صلیبی فوج نے دردانیال کو پار کیا اور ایشیائے کوچک اور شام سے گذر کر آہستہ آہستہ بیت المقدس کی طرف بڑھی، لیکن کس شان سے؟ بستیوں کو اجاڑتی، لہلہاتے کھیتوں کو جلاتی، خون کی ندیاں بہاتی، ننھے مردوں عورتوں اور بچوں کو طرح طرح کی اذیتوں کے ساتھ موت کے گھاٹ اتارتی ہوئی۔

اس فوج کے لوگ رستے میں مردار ہی نہیں، آدمی کا گوشت تک کھا چکے تھے، ان کی پیاس زندگی کے تمام آثار مٹائے بغیر بجھ نہیں سکتی تھی۔ اسی شہر میں جہاں حضرت عمرؓ نے گرجا کے احاطے میں نماز پڑھنے سے انکار کیا تھا کہ شاید مسلمان ان کی نقل کریں اور گرجا پر قبضہ کرنا چاہیں، ان لوگوں نے مسجدوں میں گھس کر ان بے چاروں کے خون سے جنھوں نے وہاں پناہ لی تھی مسجد کے احاطہ کو تالاب بنا دیا، یہودیوں کو ان کی عبادت گاہوں میں بند کرکے آگ لگادی اور پھر بھوت بن کر اس ویرانے پر راج کرنے

لگے ۔ اب اس تصویر کا دوسرا رُخ دیکھیے۔ مسلمان قریب ساٹھ برس سے دیکھتے آئے ہیں کہ عیسائی ان کی جان کے دشمن ہیں، یورپ سے جو نیا ریلا صلیبی سپاہیوں کا آتا ہے وہ ستم ڈھانے کی کوئی نئی ترکیب اپنے ساتھ لاتا ہے اور ان کی آنکھوں کے سامنے ایک شاداور آباد ملک گھائل پڑا ہے۔ لیکن جب سلطان صلاح الدین بیت المقدس پر قبضہ کرتا ہے تو نھوں کیا سپاہیوں کو بھی امان دی جاتی ہے۔ بہن اور بھائی، شوہر اور بیوی، ماں اور بیٹے جو لڑائی کی ہل چل میں جدا ہو گئے ہیں تلاش کر کے ایک دوسرے کے پاس پہنچائے جاتے ہیں، بہت سے لوگ جو معاہدے کے مطابق روپیہ دے کر اپنی آزادی خرید نہیں سکتے ان کو یہ روپیہ معاف کر دیا جاتا ہے، بعض ایسے بھی ہیں جن کی طرف سے صلاح الدین اور اس کے بھائی اپنی جیب سے یہ روپیہ ادا کرتے ہیں، اور اس کے علاوہ ان کو سفر کا خرچ بھی دیتے ہیں۔ اس شرافت کی داد اگر کچھ دی تو انگلستان کے بادشاہ رچرڈ کی شرمندگی اور ندامت نے، دوسرے اس کی کیا قدر کرتے جب انھوں نے اپنے انھی عیسائی بھائیوں کو جنھیں مسلمانوں کی رحم دلی نے ساحل تک بسلامت پہنچا دیا تھا کتوں کی طرح مار بھگایا اور انھیں بھوکوں مرنے دیا۔ عیسائیوں کے مذہبی رہنماؤں نے بھی مسلمانوں کی شرافت اور ان کے ہر احسان کی یاد کو تعصب کی آگ میں جلا دیا، اور

عیسائیوں کے خیال میں مسلمان بے دین اور سنگدل، وحشی اور ناپاک ہی رہے
مسلمانوں نے بہر حال اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ وہ نقصان میں رہے لیکن
خدا کی خدمت اور دنیا پر احسان وہی کر سکتا ہے جو ایسے نقصان کو خوشی سے
گوارا کرے، اس لئے کہ آدمیت ایسے ہی نقصان پر پلتی ہے۔

صلیبی جنگوں کا زمانہ وہ تھا جب عباسیوں کی سلطنت کا سورج
ڈوب چکا تھا، اور ترکستان کی خانہ بدوش نسلیں ایران اور عراق پر للچائی نظریں
ڈال رہی تھیں۔ مغرب میں صلیبی جنگیں مسلمانوں کے اخلاق اور تہذیب کا امتحان
لے چکی تھیں کہ شمال مشرق سے تاتار ٹوٹ پڑے، اور جیسا کہ دنیا کا دستور ہے
ایک تہذیب مٹائی گئی کہ دوسری اس کی جگہ لے سکے۔ لیکن عیسائیوں کے
برخلاف ان نئے دشمنوں میں دوستی کا بھی مادہ تھا، وہ بہت جلد مسلمانوں
کی تہذیب کے محافظ اور علم بردار بن گئے، اور مشرق کے ڈھلتے دن کو ایک
نئی روشنی سے چمکا دیا۔

(۱۱)

مسلمانوں کی تہذیب

مسلمانوں کی تہذیب کا ذکر چھیڑیے تو دمشق اور بغداد کی رونق ہارون رشید کا دربار، الحمرا کا محل، اور الف لیلا کی کہانیاں فوراً یاد آجاتی ہیں اور ہمارا خیال ایک طلسمی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جس میں ہر طرف حسن اور صنعت کی جادوگری دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ تو افسانہ ہے تاریخ نہیں۔ تاریخ تو کچھ اور ہی منظر دکھاتی ہے، بلکہ یوں کہیے کہ الف لیلا کے جنوں اور پریوں کا جادو مورخوں کی جادوگری کے سامنے نہیں چلتا، محل اور باغ اور تہذیب کا ٹھاٹھ خواب کی طرح غائب ہو جاتا ہے اور یہی ناکام اور بے چین دنیا پھر اپنا اداس چہرہ لے کر سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ مسلمان اس زمانے کے لوگوں اور

ان کے کاروبار کو یا تو کسی خاص عقیدے کے گز سے ناپتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ زندگی کے لیے آزادی اور وسعت ضروری ہے، جو ناپی نہیں جاسکتی، یا وہ یورپی مورخوں کے علم اور بے تعصبی کے دعوے سے دھوکا کھاتے ہیں۔ اس کے دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی ڈیڑھ دو سو برس سے یورپی تہذیب ایک پہاڑ کی طرح ہمارے سامنے آکر کھڑی ہوگئی ہے، اور مسلمانوں کی تہذیب کا جو کچھ حصہ تاتاروں کے ظلم اور ستم سے بچ رہا تھا وہ بھی ہماری نظروں سے چھپ گیا ہے۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس دور کے مسلمانوں کے مذہبی وارث ہم ہیں تو مگر ان کی تہذیب کا سلسلہ ہماری موجودہ زندگی سے نہیں ملتا بلکہ یورپ کی تہذیب سے، اور ہم اس میں وہی چیزیں تلاش کرکے رہ جاتے ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں، عقیدے، قانون، دو چار رسمیں۔ یورپ والوں کا حال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تہذیب کی عمارت پرائی زمین پر بنائی ہے، اور اس وجہ سے وہ موقع بے موقع جتاتے رہتے ہیں کہ زمین کے پچھلے مالک کا قبضہ بالکل ناجائز تھا، اور اسے بدنام کرکے اپنا حق مضبوط کرتے ہیں۔

ہم اس زمانے کے علم کو دیکھیں یا عام تہذیب کو، یورپی مورخ یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ عربوں نے بس قلیوں کی طرح ایک جگہ کا سامان اٹھاکر

دوسری جگہ پہنچا دیا، اور ظاہر ہے کہ اس طرح جگہ بدل جانے سے مال بڑھ نہیں سکتا۔ لیکن یہ مانتے ہوئے کہ مسلمانوں سے پہلے دنیا ترقی کر چکی تھی اور ان کی تہذیب کے اس دور کے بعد بھی کرتی رہی، ہم دیکھتے ہیں کہ عرب اپنے ساتھ ایک دولت لائے تھے جو اُس وقت کہیں بھی موجود نہ تھی، اور یہ دولت نہ ہوتی تو آپ آجکل دنیا میں وہ ترقی نہ دیکھتے جس پر ہم اچنبھا کرتے ہیں۔ یہ دولت کیا تھی؟ آزادی کا ایک نیا اصول، انسانیت کا تصور، علم حاصل کرنے کی دُھن، زندگی کو ترقی دینے کا شوق اور اس تمام سرمائے کو جو قدرت نے آدمی کے دل اور زمین کے سینے میں بھرا ہے کام میں لانے کا حوصلہ۔

آپ کہیں گے کہ آزادی کا یہ اصول کیسا تھا جس نے غلامی کی رسم قائم رکھی؟ لیکن اس زمانے میں غلامی اسی طرح مجبوری تھی جیسے آج کل کی مزدوری، اس وقت غلامی کو مٹانا اتنا ہی مشکل تھا جتنا کہ آجکل مزدوروں سے کہنا کہ کوئلے کی کانوں میں جہاں تمہاری جان ہر وقت خطرے میں رہتی ہے کام نہ کرو، یا ان تمام صنعتوں کو ختم کر دینا جو کہ انسان کے مصیبت جھیلنے اور جان جوکھم میں ڈالنے کا پھل ہیں۔ زمانے کی مجبوری نے جو حد مقرر کی تھی اس کے اندر ہم دیکھتے ہیں کہ غلاموں کے لئے جو کچھ کیا جا سکتا تھا کیا گیا۔ غلام

ہونے میں کوئی بدنامی نہیں تھی، کوئی ایسا دھبا نہیں تھا کہ جو لگ جائے تو پھر چھڑائے نہ چھوٹے۔ غلاموں نے آقاؤں سے محبت کا رشتہ قایم کیا تو اولاد کے برابر ہر چیز کے حقدار ہوئے، لونڈیاں نکاح کے بعد پوری بیویاں بن گئیں، اور اوسط لیجئے تو ان کا حال قریب قریب وہی تھا جو آجکل نوکروں کا۔ لونڈی غلاموں کی تجارت بے شک بہت بری چیز ہے، مگر یہ تجارت کس نے نہیں کی؟ مسلمانوں کے عہد میں فرانس اور اٹلی والے برابر ہسپانیہ میں غلام بیچتے رہے، اور اٹھارویں صدی کے آخر تک انگلستان کے کاروبار میں افریقہ سے وحشی پکڑ کر امریکہ والوں کے ہاتھ انھیں بیچنا بڑی اہمیت رکھتا تھا اور اس سے بڑا منافع حاصل کیا گیا۔ یورپ میں غلاموں کی تجارت بند اس لئے ہوئی کہ غلام ملنا بند ہو گیا۔ اس لئے نہیں کہ انسانیت کی خاطر لوگوں نے اس بیوپار کو چھوڑ دیا۔ اور ان تمام صدیوں میں جب کہ اس تجارت کا بازار گرم تھا ہم یورپ یا امریکہ میں یہ نہیں دیکھتے کہ غلاموں میں سے کسی نے بڑی حیثیت بھی پائی۔ مسلمانوں کی دنیا میں بہت سے غلام تھے جو حاکم ہوئے، سپہ سالار ہوئے، بادشاہ ہوئے وہ بیچارے جو یورپ والوں کے ہتھے چڑھے غلام ہی رہے۔

میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ یونان اور روم میں محنت مشقت کے

سارے کام غلاموں سے لئے جاتے تھے، اور کسان بھی ہر جگہ غلام ہوتے تھے۔یورپ میں کسانوں کی غلامی اس وقت بھی باقی رہی جب غلاموں کی تجارت بند ہو چکی تھی، اور کہیں انیسویں صدی میں جا کر آہستہ آہستہ ختم ہوئی، وہ بھی اس لئے نہیں کہ زمیندار اور حاکم کسان کے ہمدرد بن گئے تھے بلکہ صنعتی انقلاب کی بدولت۔ مسلمانوں کا اثر جہاں جہاں پڑا انھوں نے کسان کو غلامی سے آزاد کیا، اور اسے ریاست کا حق ادا کرنے کا ذمہ دار بنا کر شہری کا پورا حق دیا۔ شام اور فلسطین کے ان حصوں میں جہاں صلیبی فوج کے سرداروں کا چند سال کے لئے قبضہ ہوا زرعی غلامی دوبارہ رائج کی گئی، مشرق میں ہم اسے اور کہیں نہیں دیکھتے۔

غلام اور کسان سے آگے بڑھئے تو بھی آپ آزادی کو بڑھتے دیکھیں گے۔ کاریگر اور دستکار، اگرچہ وہ کسان کی طرح سماج کے جسم کا خون تھے، ایتھنز کے سوا ہر جگہ ذلیل سمجھے گئے، اور ان کی حیثیت غلاموں سے بس کچھ ہی بہتر تھی۔ وہ اپنا پیشہ اس لئے اختیار کرتے تھے کہ ان کے باپ دادا یہی کرتے آئے تھے، اور یہ بھی ایک طرح کی غلامی تھی۔ مسلمانوں نے ہنر کی وہ قدر شروع کی جس نے ہر فن کے جاننے والے کو استاد کا مرتبہ دیا، اور اہل ہنر کی قدر شناسی کو تہذیب کا معیار بنا دیا۔ مسلمانوں کی تہذیب

کے اسی دور سے ان پیشوں کی ابتدا ہوتی ہے جنھیں آزاد پیشے، Free Professions. کہتے ہیں۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ یونان میں بچوں کو تعلیم دینا گھر کے غلاموں میں سے ایک غلام کا کام تھا، قدیم ہندوستان میں ڈوم اور چنڈال کی طرح وید بھی اچھوت سمجھے جاتے تھے، یونان اور ہندوستان کا علم اور فلسفہ تھوڑی سی برگزیدہ شخصیتوں کی یادگار رہے، یہاں کی زندگی پر علم نے کبھی اپنا رنگ نہیں چڑھایا اور فلسفے اور معیشت، علم اور صنعت کے درمیان کبھی اور کہیں ایسا سمجھوتا نہیں ہوا کہ وہ ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔ مسلمانوں نے دنیا کی تاریخ میں پہلی بار علم، تجارت، صنعت سب کو آزاد کیا۔ سب کو برابر کا مرتبہ دیا اور سب کو اتحادِ عمل کی طرف مائل کیا۔

ساتویں صدی عیسوی میں جو تہذیبیں موجود تھیں اور ان سے پہلے کی جتنی تہذیبیں تھیں وہ سب نسلی اور ملکی تھیں، ان کا بھی ایک دوسرے پر اثر پڑا، اس وجہ سے کہ بادشاہوں کے حوصلے نسل، ملک اور مذہب کی حد کے اندر نہیں رہے۔ لیکن فتح اور زبردستی تنگ نظری کو مٹا نہ سکی اور کوئی قوم اپنے دل اور اپنے دھرم میں دوسروں کے لئے جگہ نہ کر سکی۔ مسلمانوں کو سکھایا گیا تھا کہ ہر انسان کو خدا کا بندہ اور

ساری انسانی جماعت کو ایک برادری جانیں، جو ان سے دوستی کرنا چاہیں ان سے دوستی کریں، اپنے آپ کو ان کی سلامتی کا ذمہ دار بنائیں، ہر مذہب اور ہر قوم کا ادب کریں، اور علم حاصل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا دیکھنا اور ہر معاشرت اور ہر قسم کے خیالات کا مطالعہ کرنا ان کا ایک خاص شوق تھا۔ کئی عرب سیاح تھے جنھوں نے ساری آباد دنیا کی سیر کی اور جو کچھ انھوں نے دیکھا اسے خود سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اُنھی سیاحوں میں سے ایک استاد البیرونی تھے جو محمود غزنوی کے زمانے میں ہندوستان آئے۔ ان کا مقصد یہاں کے علم ہیئت، آکاش ودیا، کا مطالعہ کرنا تھا، لیکن انھوں نے اپنی کتاب میں مطلب کی باتوں کے ساتھ ہندوستانیوں کے مذہب، معاشرت اور خیالات کے بارے میں جو کچھ معلوم ہو سکا وہ بھی لکھ دیا۔ ان کی کتاب الہند معلومات کا ایک خزانہ ہے، لیکن اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ وہ بے تعصبی کا ایک کرشمہ ہے جس کا جواب دنیا کی کسی زبان میں اب بھی نہ ملے گا۔ آج بھی لوگ سیر کرتے ہیں، مگر یہ بتانا مشکل ہوتا ہے کہ سیر کہاں پر ختم ہوتی ہے اور جاسوسی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ آج کل بھی لوگ ہندوستان کے مذہب اور معاشرت کا

مطالعہ کرنے آتے ہیں، مگر کوئی عیب ہی عیب نکالتا ہے، کوئی ایسی میٹھی باتیں کرتا ہے کہ خیال ہوتا ہے ہماری آنکھوں میں دھول جھونکی جارہی ہے۔ مسلمانوں پر بڑے بڑے الزام لگائے گئے ہیں، مگر حق کی عدالت کے سامنے استاد البیرونی کی ایک کتاب بہتیرے الزاموں کو غلط ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

میں کہہ یہ رہا تھا کہ اس دور میں مسلمانوں نے صرف قریب کی قوموں سے اثر نہیں لیا، بلکہ علم اور ہنر کی تلاش اور انسانی زندگی کی رنگ برنگی تصویر کو دیکھنے کے شوق میں وہ دور دور نکل گئے، اور انھوں نے جو یادگاریں چھوڑی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا شوق سچا تھا۔ انھیں علم کی تلاش اور دنیا دیکھنے کا شوق اس وجہ سے ہوا کہ ان کا ذہن قوم اور ملک اور دھرم کی پابندیوں سے آزاد کیا گیا تھا، اور اس آزادی سے فائدہ اٹھائے بغیر وہ پورے مسلمان نہیں ہو سکتے تھے۔ میں یہاں پر ان کے علمی کارنامے گن نہیں سکتا، کہ انھوں نے یونانیوں کے علم اور فلسفے کو کس طرح اختیار کیا اور آزمایا، اسے کس طرح بدلا اور بڑھایا، انھوں نے تاریخ کو کس طرح الگ الگ قوموں کی داستان نہیں بلکہ انسانی برادری کی کہانی بنانے کی کوشش کی، اور مورخ کا یہ فرض ٹھہرایا کہ زندگی کے بھید بوجھے ہیں۔

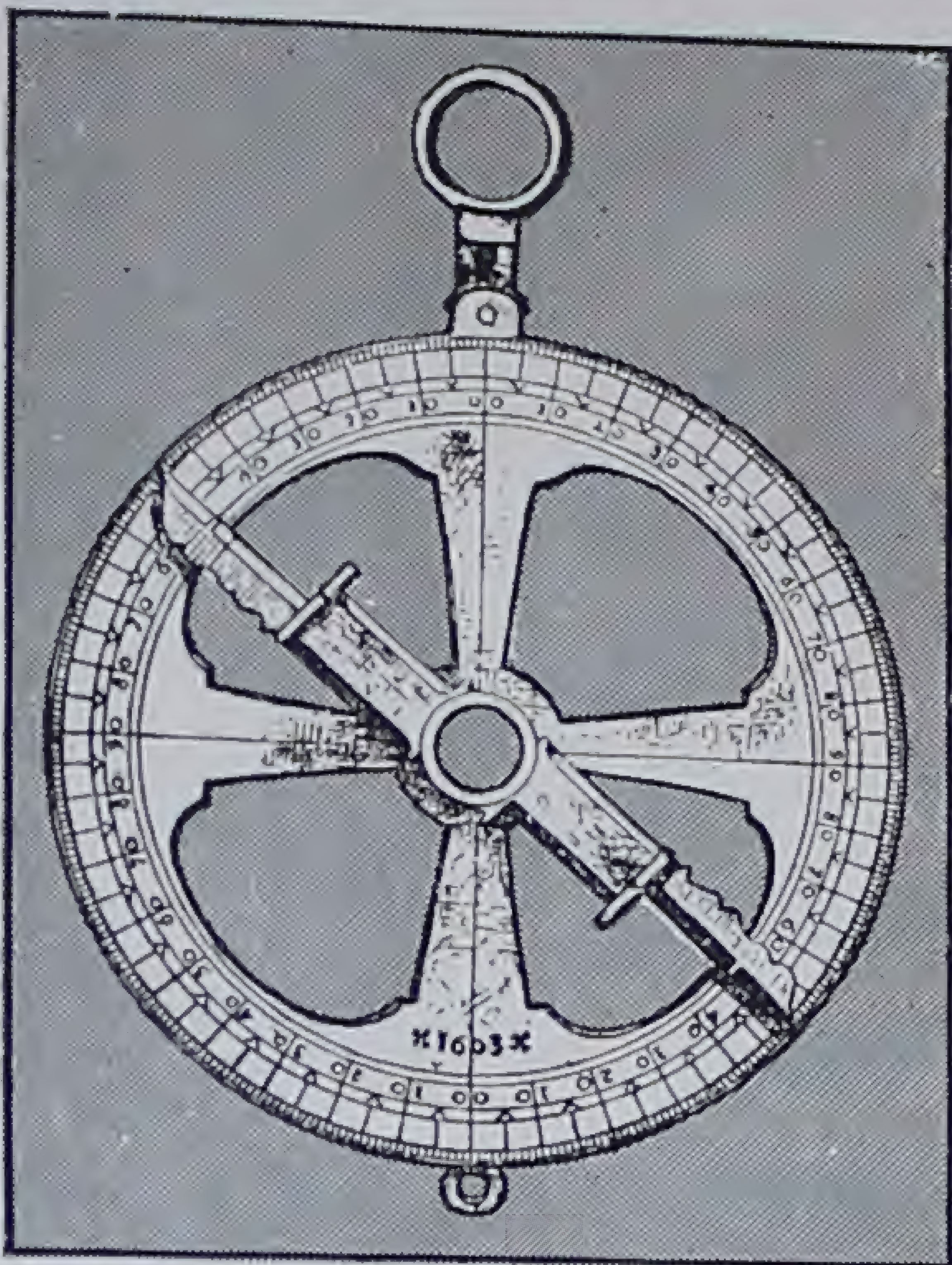
یہاں پر یہ نہیں بتا سکتا کہ ریاضی، طب اور سائنس کے مختلف شعبوں میں انھوں نے کیسا کمال حاصل کیا، اور فنونِ لطیفہ یعنی آرٹ کے کیسے کیسے معجزے دکھائے یہاں پر میں صرف وہ نتیجے بیان کر سکتا ہوں جو اس دور کی علمی زندگی سے نکالے جا سکتے ہیں، تاکہ آپ دنیا کی کہانی کے اس ٹکڑے کی جو اہمیت ہے اس کا اندازہ کر سکیں۔

اسلام نے پرانے مذہبوں کی طرح دین اور دنیا کو ایک دوسرے کا دشمن ٹھیرانے کی جگہ دین کو دنیاوی علم کا جوہر اور دنیا کو دین کا میدانِ عمل بنایا تھا، مسلمانوں میں سارا علم کیا، خاص مذہبی علم بھی کبھی ایک فرقے یا طبقے یا ذات کے قبضے میں نہیں آیا، جو اسے اپنی جائداد سمجھتا اور دوسروں کو اس سے الگ رکھنے کی تدبیریں سوچتا۔ اس کے برخلاف یورپ میں ایک مذہبی علم ہی نہیں بلکہ سارا علم اور تعلیم حاصل کرنے کے تمام ذریعے صدیوں تک پادریوں کے ہاتھ میں رہے، ان کی تنگ نظری اور تعصب نے علم کو ترقی کرنے سے روکا اور عالموں کی قدم قدم پر مخالفت کی، اس لئے یورپ میں مذہب اور علم کے درمیان بڑی سخت لڑائی ہوئی، اور روشن خیال آدمیوں کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ جب تک آدمی کے ذہن پر مذہب کا اثر ہو وہ علم حاصل نہیں کر سکتا اور حاصل بھی کرے تو اس سے فائدہ نہیں

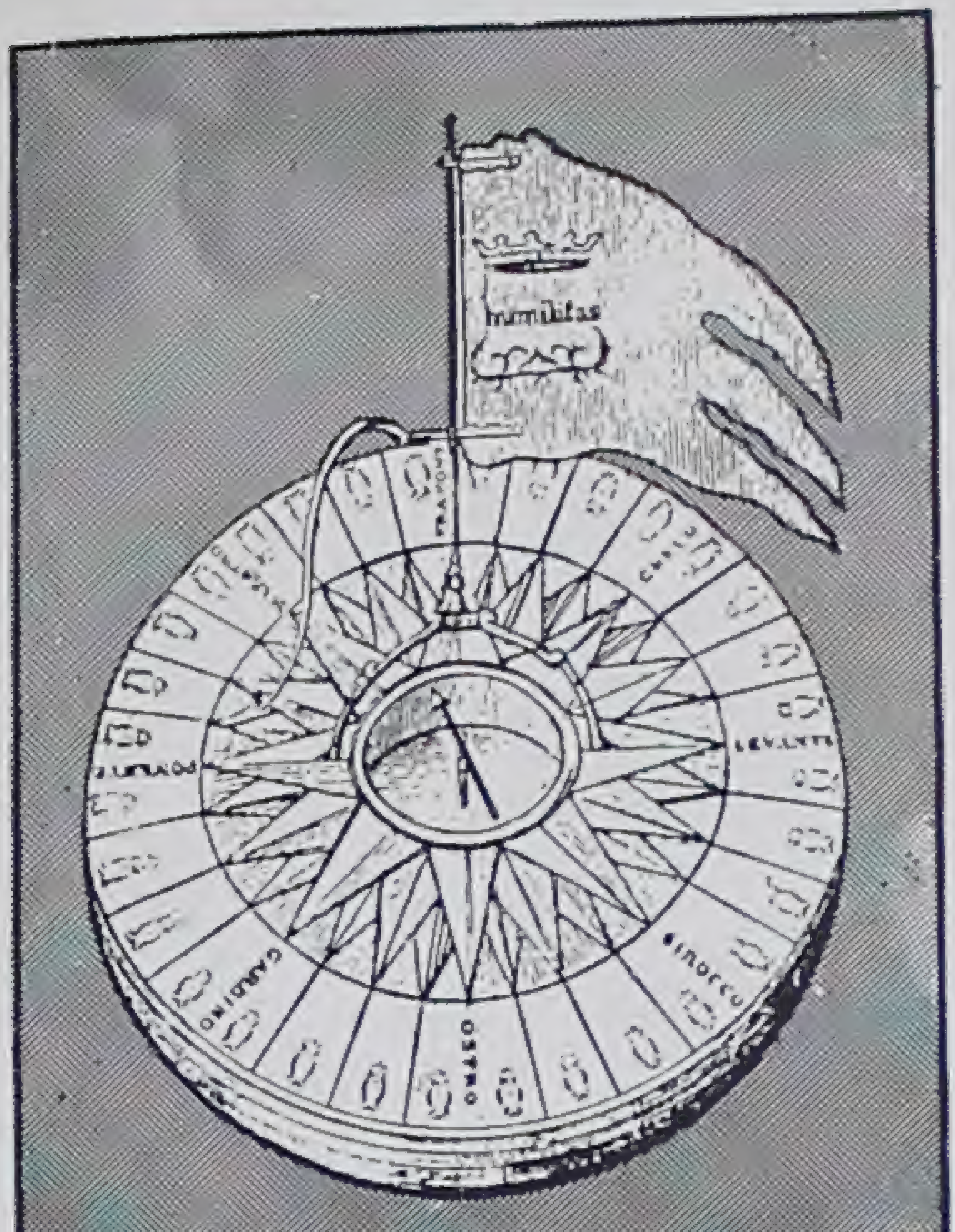
اٹھا سکتا۔ یورپ والوں کے اس تعصب میں آجکل ہم لوگ بھی مبتلا ہو گئے ہیں
ہم نے بھی سمجھ لیا ہے کہ مذہب اور سائنس ایک دوسرے کی ضد ہیں، مذہب
مشرق والوں کا حصہ ہے اور سائنس مغرب والوں کا۔ یہ خیال بالکل غلط
ہے، اور اس کا اب تک رائج ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ہم نہ
مذہب کو جیسا کہ چاہیے سمجھے ہیں اور نہ سائنس کو۔ مسلمان اب یہ کوشش
کرتے ہیں کہ اپنے مذہب کو سائنس کے حملوں سے بچائے رکھیں، اور یہ
بھول گئے ہیں کہ اسلام نے عقیدے کی بنیاد علم پر اور سائنس پر رکھی ہے،
اور جس کا علم سچا ہو اس کا عقیدہ بھی سچا ہو گا۔ لیکن جس زمانے کا میں ذکر
کر رہا ہوں اس وقت مسلمان علم اور سائنس سے ڈرتے نہ تھے، اور
انھوں نے وہ تمام اصول دریافت کیے اور تسلیم کیے جن پر علم اور سائنس
کا بھروسا ہے اور جو یورپ والوں کی خاص ایجاد مانے جاتے ہیں۔ وہ
اس اصول سے واقف تھے کہ ہمارے علم کا پہلا سبق شک ہے کیونکہ
جب تک شک نہ ہو آدمی کو حقیقت معلوم کرنے کی فکر نہیں ہوتی، وہ یہ بھی
جانتے تھے کہ علم پر اعتبار اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب ہم زیادہ سے
زیادہ معلومات اکٹھا کریں، انھیں ترتیب دیں اور ان سے وہی نتیجے
نکالیں جو معلومات کی بنا پر صحیح ثابت کیے جا سکتے ہوں۔ تجربہ کرنا،

آزمانا، اور اس طرح معلومات کو آہستہ آہستہ بڑھانا بھی علم کا مانا ہوا اصول تھا اور یونانی طب کو، جو اس وقت کی سائنس کی ایک بڑی یادگار ہے اسی طرح علم کے مرتبہ تک پہنچایا گیا۔ اس وقت کے عالم یہ نہیں سمجھتے تھے کہ دنیا کا سب سے اچھا زمانہ گذر چکا ہے اور آدمی کی حالت خراب ہوتی جارہی ہے، بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ زندگی پھیلتی اور آگے بڑھتی رہتی ہے، اور بعض عالموں نے تو اس بات کو یہ دکھا کر ثابت کیا کہ زندگی نے آہستہ آہستہ بہتر شکلیں اختیار کی ہیں اور پودوں اور حیوانوں کے ارتقا کا ایک سلسلہ قائم کیا جو آجکل کے علم کے مطابق بھی قریب قریب صحیح ہے۔

یہ علمی کارگذاری چند عالموں کے ناموں کے ساتھ لگی ہوئی نہیں ہے۔ اس زمانے میں سستا کاغذ بہت بننے لگا تھا، چھاپے خانے تو نہیں تھے مگر ہاتھ سے لکھ کر بھی کتابیں خاصی بڑی تعداد میں تیار کر لی جاتی تھیں اور بڑے شہروں میں کتابوں کی بیسیوں دکانیں ہوتی تھیں علم اور عالموں کے مرکز پہلے بھی ہوا کرتے تھے، اب ہم یہ نئی بات دیکھتے ہیں کہ شہر شہر اور محلے محلے میں مدرسے قائم ہوتے ہیں، اور بغداد اور چھ سات اور شہروں میں خاصی بڑی یونیورسٹیاں بنتی ہیں جن میں



اسطرلاب



An early compass.

قطب نما

اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ جن اصولوں اور علمی رجحانات کا اوپر ذکر آیا ہے وہ چند لوگوں کی دولت نہیں تھے بلکہ تعلیم گاہوں کے ذریعے بہت سے لوگوں تک پہنچے اور عام خیالات پر بھی اثر ڈالا۔

نئے علمی شوق اور ترقی کی خواہش نے بس مدرسے اور یونیورسٹی کی شکل ہی نہیں پائی۔ دنیا کی تاریخ میں ہم پہلی مرتبہ دیکھتے ہیں کہ دواخانے، ہسپتال اور پاگل خانے تک بڑی تعداد میں قائم ہوئے، انھیں ریاست ہی نے نہیں بلکہ پبلک نے بھی قائم کیا، اور اس طرح علم نے جو کچھ حاصل کیا تھا اس سے عام زندگی کو فیض پہنچا۔ دل اور دماغ کی بیداری نے اور صنعت کی ترقی نے رہن سہن میں نفاست پیدا کی، معمولی حیثیت کے لوگ بھی اپنے گھروں میں قالین بچھانے اور پردے ٹانگنے لگے، جسم کی صفائی کا بہت خیال کیا جانے لگا، اور مردوں اور عورتوں کے میل جول میں تکلف اور لحاظ برتا جانے لگا۔ عورتوں کی اسلام نے جس طرح حیثیت بڑھائی وہ میں بیان کر چکا ہوں۔ یہ حیثیت قانوناً تو نہیں بدلی، لیکن دوسری قوموں سے اثر لے کر مسلمانوں نے اپنی عورتوں کا بہت کچھ حق مار لیا۔ پھر بھی وہ گھروں میں بند نہیں رہتی تھیں، بہتیری ایسی تھیں جنھوں نے علم میں بڑا مرتبہ حاصل کیا اور اعلیٰ تعلیم گاہوں میں درس دیا، کئی نے شعر و شاعری میں نام پیدا کیا

اور بعض نے ہتھیار باندھ کر لڑائیوں میں بھی حصہ لیا۔ لیکن ہر طرح کا تہذیبی شوق رکھنے کے باوجود یہ عورتیں عورتیں رہیں، اگر آپ ان کا ان عیسائی عورتوں سے مقابلہ کیجئے جو صلیبی جنگوں میں اپنے شوہروں کے ساتھ گئی تھیں، مردوں میں بیٹھ کر شراب پیتی تھیں اور مست ہو کر زمین پر لوٹتی تھیں، بیہودہ گیت سنتی اور فحش گفتگو کرتی تھیں تو آپ کو اس کی شکایت نہ ہوگی کہ مسلمان عورتیں گھر کے الگ حصے میں رہتی تھیں اور مردانی صحبتوں میں ان کا بیٹھنا عام رواج نہ تھا۔

یورپی قوموں کی ذہنی اور معاشرتی تہذیب ایک طرف تو ہسپانیہ اور سسلی (صقلیہ) کے مسلمانوں کی درس گاہوں اور عام شہری زندگی کے اثر سے اور دوسری طرف اس مڈبھیڑ سے جو صلیبی جنگوں کی بدولت ہوئی مسلمانوں کی درس گاہوں نے یورپی قوموں کا علوم و فنون سے تعارف کرایا، یونانی تہذیب کا ورثہ ان تک پہنچایا اور علم حاصل کرنے کا ایک شوق پیدا کیا جس نے بڑھتے بڑھتے نشاۃِ ثانیہ Renaissance کا نام پایا۔ مسلمانوں کی ہر جگہ ایک بڑی تہذیبی خدمت یہ تھی کہ انھوں نے بول چال کی زبان کی قدر بڑھائی، یورپ میں ہسپانی اور اطالوی، ایشیا میں فارسی، سندھی، ہندی، بنگالی نے ان کی سرپرستی

کی بدولت ادبی زبانوں کی حیثیت پائی۔ عربوں کی شائستہ معاشرت ان کی صفائی، ان کا لباس، ان کا خوش نما اور آرام دہ مکان، یہ سب یورپ والوں کے لئے نمونے تھے، اور صدیوں تک وینس اور جے نوا کی تجارتی جمہوری ریاستوں کو اس سبب سے ترقی ہوتی رہی کہ وہ مسلمانوں کے صنعتی مال کو یورپ کے اندر پہنچاتی تھیں۔ عیسائی سماج کو اسلامی اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے رومی کلیسا نے تعصب کی ایک دیوار بنا کر کھڑی کی اور غیروں کی قدر شناسی کو ایک ایسا سنگین جرم ٹھیرایا کہ مسلمانوں کی تہذیب کی خوبیوں کا اعتراف صرف افراد اپنے دلوں کے اندر کر سکتے تھے اور انہیں بھی وحشیانہ سزاوں سے بچنے کے لئے مسلمانوں پر علانیہ لعنت بھیجنا پڑتی تھی۔ صلیبی جنگوں کے ذریعے سے یورپی قوموں کو تعلیم دینے میں مسلمانوں کا بڑا نقصان ہوا، فلسطین اور شام کے اتنے شہر لٹ کر برباد ہوئے اور ان کی صنعت اور تجارت کو ایسا سخت صدمہ پہنچا کہ ان کے پھر آباد ہونے کی نوبت نہ آئی۔

تیرھویں صدی میں تاتاروں کا ایران اور عراق پر ٹوٹ پڑنا تقدیر کا دوسرا وار تھا جس نے ان ملکوں کی تہذیب کو خاک میں ملا دیا۔ اس بربادی کا بھی ایک نتیجہ یہ ہوا کہ تہذیب کی دولت ایشیا کی نئی نسلوں میں پھیلی اور بربریت کا

آخری مورچہ فتح ہوا۔ اس سوال کا جواب مورخ ہی سے نہیں اپنے دل سے بھی پوچھئے کہ کسی تہذیب کے قائم رہنے اور دوسروں کی کمزوری اور جہالت سے فائدہ اٹھاکر ترقی کرنے میں زیادہ شان ہے یا عام زندگی میں سماکر اور اسے ترقی کے رستے پر کئی منزلیں آگے پہنچاکر مٹ جاتے ہیں۔

(۱۲)

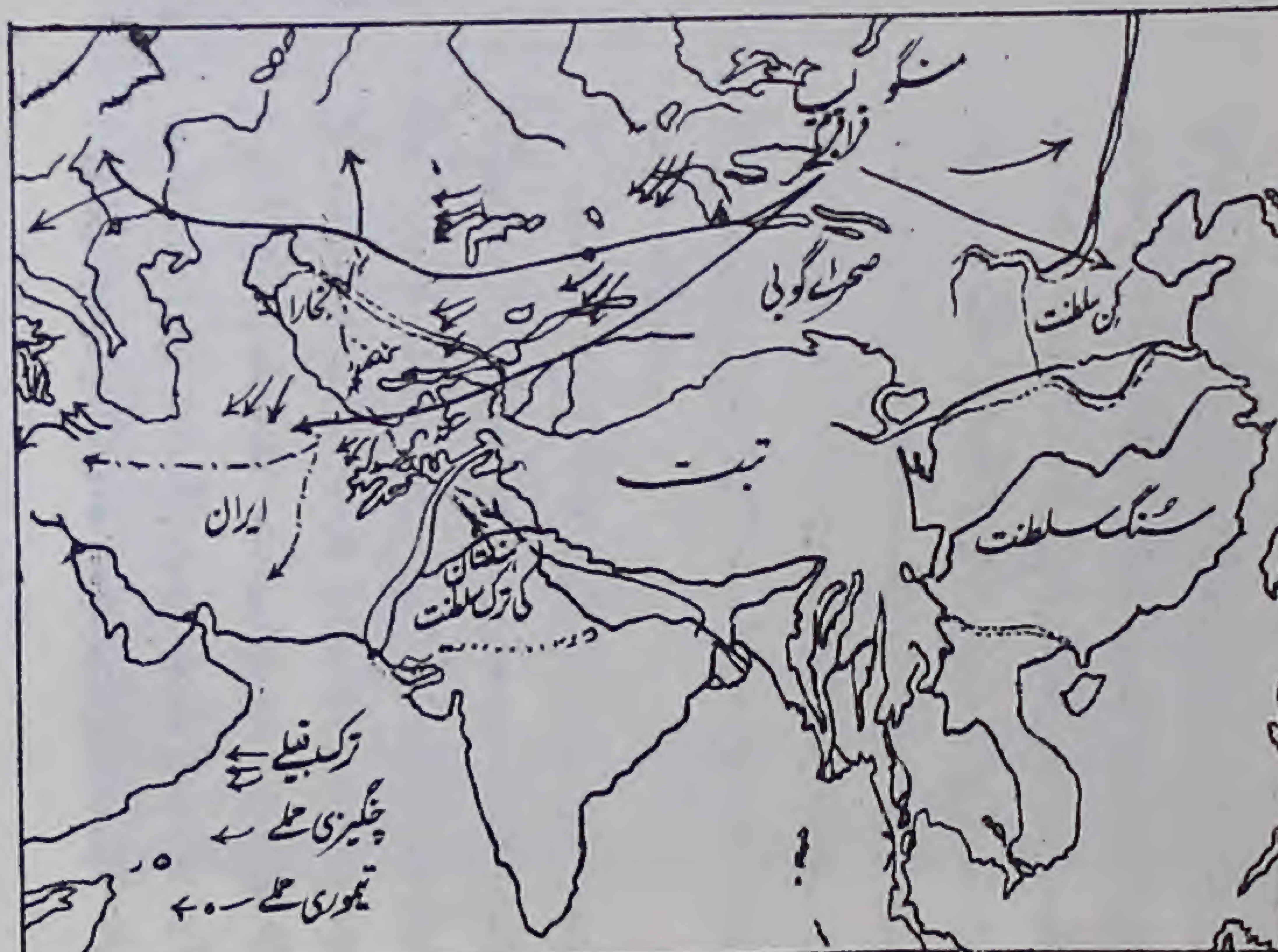
ترک اور تاتار

مسلمانوں کی پہلی تہذیب بڑی حد تک عربوں کے حوصلے اور استعداد کی یادگار ہے۔ عربوں میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو تہذیب کے رہبروں میں ہونا چاہئیں، مگر یہ بڑا عیب بھی تھا کہ وہ ذرا ذرا سے جھگڑوں کو بڑھاتے بڑھاتے تاریخی فتنے بنا دیتے تھے۔ انھوں نے دوسروں پر بڑے احسان کئے، مگر اپنوں کی تباہی کے ہمیشہ درپے رہے۔

ان کے زوال کے بعد مشرقی دنیا کی سرپرستی اور پرورش کی ذمہ داری قسمت نے ایرانیوں، ترکوں اور تاتاروں پر ڈالی۔ ان کی تہذیب میں وہ آن بان نہ تھی جو دمشق اور بغداد، قرطبہ اور غرناطہ میں اپنی چھب دکھلا گئی تھی، اس وقت مسلمان اپنے علم اور اپنے ذہن کو تقلید یعنی بزرگوں کی

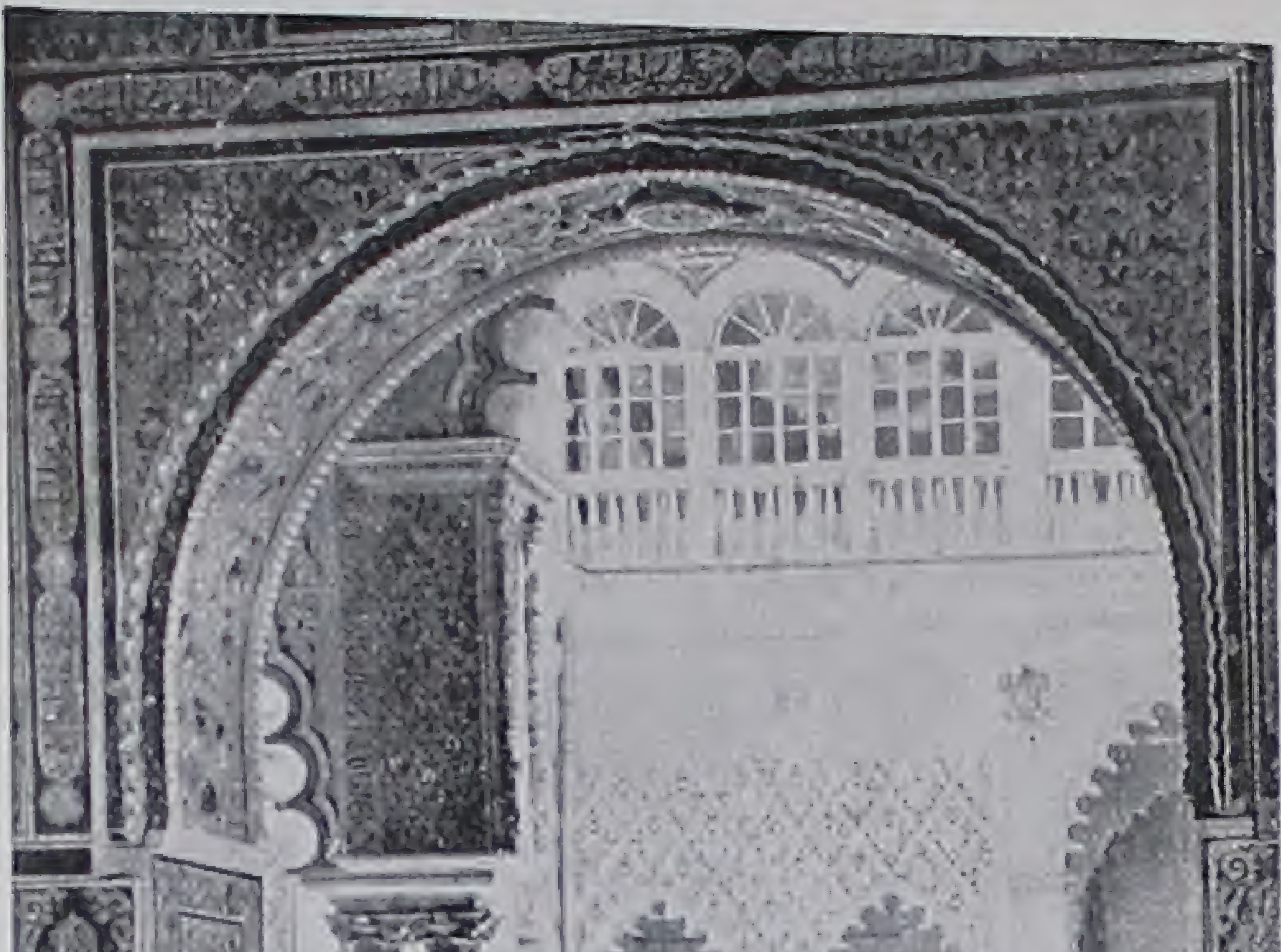
پیروی کے اصول میں نظر بند کر چکے تھے، ان کے سیاسی اخلاق میں وہ حوصلہ ان کے عمل میں وہ لوچ، ان کی طبیعت میں وہ اپج نہ رہی تھی۔ حالات نے اب انھیں سختی اور حفاظت کی تدبیروں کی طرف بہت زیادہ متوجہ کر دیا تھا۔ اب آزاد تہذیب اور من چلے تخیل کا زمانہ گذر گیا تھا، مضبوط ریاستوں کے دن آ گئے تھے۔

ترکوں کا اصل وطن مغربی منگولیا میں دریائے اورخون اور اس کے آس پاس کی وادیوں میں تھا، اور حال میں جو تحقیق کی گئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ خاصے مہذب تھے، اور آزاد اور سادہ زندگی کی سچی قدر کرتے تھے۔ آبادی کے بڑھنے سے یہ مغرب اور جنوب کی طرف پھیلنے پر مجبور ہوئے۔ مسلمانوں کی دنیا کی جو شمالی سرحد ترکستان میں تھی اس کے پاس وہ اتنے دن رہے کہ ان کی تہذیب کی بھی قدر پہچان سکیں، اور جب اس تہذیب کے بگڑے کاموں کو بنانا ان کے حصے میں آیا تو انھوں نے دکھا دیا کہ وہ اس خدمت کو بڑی خوبی سے انجام دے سکتے ہیں۔ ایران میں سلجوق ترکوں کی حکومت قائم ہو جانے سے تہذیب کے اجالے میں ہلکے سے ابر کا بھی سایہ نہ پڑا، اور زندگی کا کاروبار صرف جاری نہیں رہا بلکہ نظام الملک طوسی کے انتظام نے اس میں اور چہل پہل پیدا کر دی۔


منگول
قراقرم
صحرائے گوبی
کن سلطنت
بخارا
ایران
تبت
سنگ سلطنت
ہندستان
کا ترک سلطنت
ترک قبیلے
چنگیزی حملے
تیموری حملے

لیکن مسلمانوں کی دنیا نے ، جو وادیوں اور پہاڑوں، شہروں اور میدانوں میں پھیلی ہوئی تھی، کچھ ایسا لالچ دلایا کہ ترک سردار مل کر حکومت کرنے اور ایک بڑے نظام کو قائم رکھنے کے بجائے اس میں سے اپنے الگ حصے نکالنے لگے۔ جب شمال میں ان کے بھائی بندوں کا جواب سرحد پر منڈلا رہے تھے، دباؤ بڑھا تو سلجوق کھسک کر اناطولیہ میں پہنچ گئے، اور پرانے ترکوں کا ایک حصہ ہندوستان میں گھس گیا۔ تاتاروں کا سیلاب تیرھوی صدی میں بند توڑ کر ترکستان اور ایران پر پھٹ پڑا تو یہاں خوارزمیوں کی ایک بہت بڑی سلطنت قائم تھی اور یہی مسلمانوں کی تہذیب کے پاسبان تھے۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ تاتاروں کی بھی اپنی تہذیب تھی، تاریخ سے مگر ہمیں اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیروں کی تہذیب کیا آبادی کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ شاید ان کی خون کی اس پیاس کا سبب ایک طرف چینی اور دوسری طرف ترکی سلطنتوں کا دباؤ تھا، اور جب ان کو ایک ایسا سردار مل گیا کہ جس کے سامنے سکندر جیسے سپہ سالار بھی نوسکھیے معلوم ہوتے ہیں تو ان کی ہمت اور قابلیت دنیا کے لئے ایک عذاب بن کر نازل ہوئی، ایسا عذاب کہ جس کے مقابلے میں ہزاروں لڑائیوں کا کشت وخون



القصر اشبیلیہ کا ایک منظر

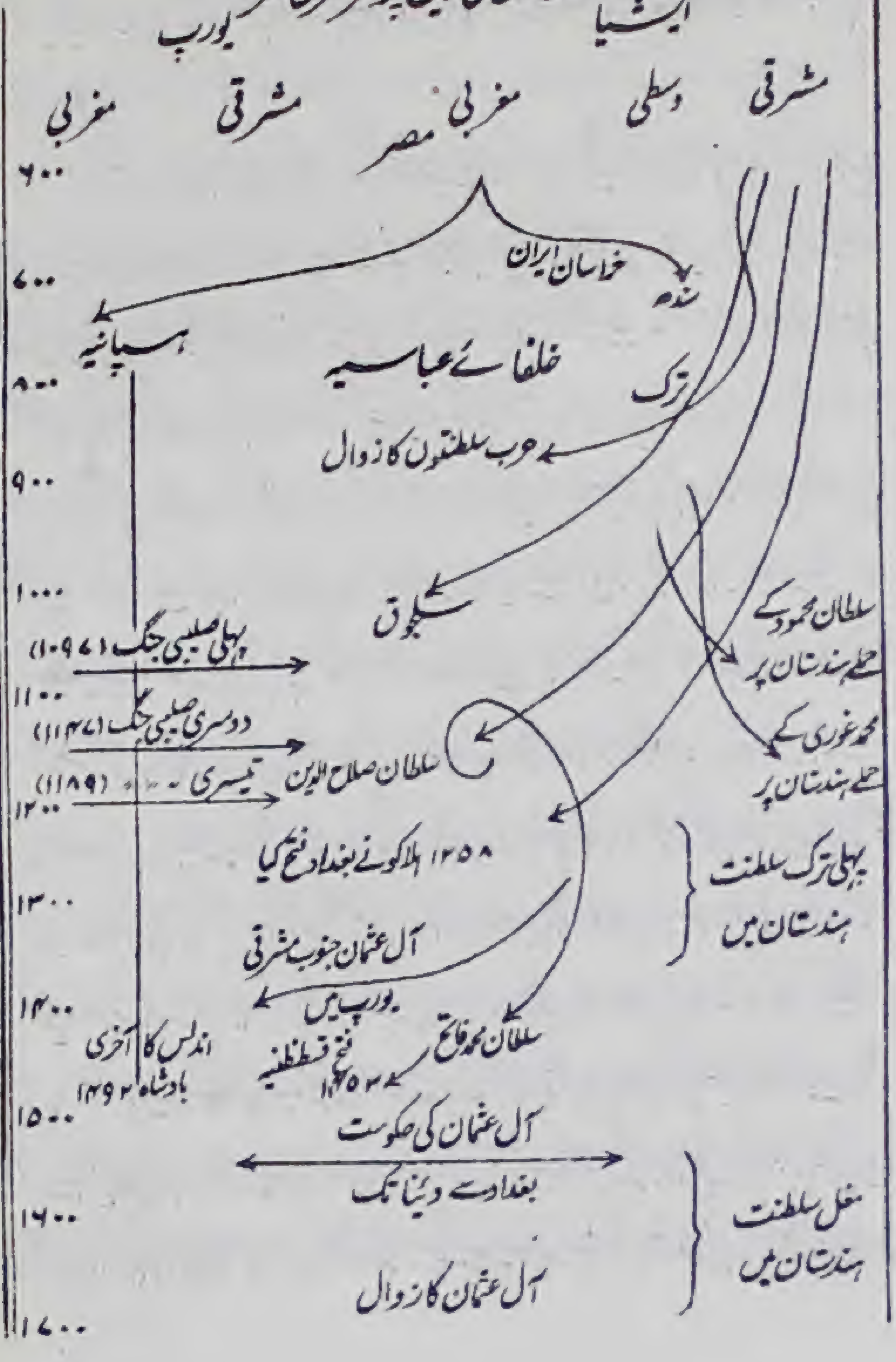
قحط اور وبائیں طوفان اور زلزلے بچوں کا کھیل لگتے ہیں۔ چنگیز خاں نے خوارزم کے دربار میں سفیر بھیجے تھے جو قتل کرا دئے گئے، اور اس کے بدلے میں اس نے شمالی ترکستان سے جنوبی ایران تک، اور دریائے سندھ سے ادھر دجلہ کے کناروں تک ہر بستی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، اور اتنے آدمی مارے کہ ہفتوں تک دریاؤں میں پانی کی جگہ خون بہا، اور ملک کے ملک ہڈیوں کے کھیت بن گئے۔ اس ظالم کو لشکر کشی کے فن میں وہ ملکہ تھا کہ دنیا اس کے سامنے شطرنج کی بساط سے زیادہ نہ تھی، اس کی چالیں ایسی غضب کی تھیں اور پٹے ہوئے مہروں کو وہ اس بے پروائی سے توڑ کر پھینکتا تھا کہ اچھے اچھے کھلاڑیوں پر ہیبت طاری ہوگئی، اور وہ بے چارے جو دنیا میں مہروں کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی جان و مال کے ساتھ کھلاڑی کھیلتے ہیں ایسے سہم گئے کہ دعا مانگنے کے لئے منہ بھی نہ کھول سکے۔ لیکن جو چنگیز خاں کا نام لے اُسے خوارزم کے شہزادے جلال الدین کی یاد بھی تازہ کر دینا چاہئے جس کی جوانمردی نے چنگیز کو بھی مات کر دیا، جو ایک مردہ دنیا میں زندگی کی لہر کی طرح دوڑتا پھرا، مگر افسوس مُردوں کو جلا نہ سکا۔ جلال الدین اس پہلی لڑائی میں جو تاتاروں اور خوارزمیوں میں ہوئی چنگیز خاں کے لڑکے کے مقابلے پر تھا، اور دن بھر لڑنے کے بعد اسے پس پا کر کے چھوڑا تھا۔

دوسرے دن صبح خوارزمی لڑنے کے لئے تیار ہوئے تو انھیں معلوم ہوا کہ تاتار غائب ہو گئے ہیں اور وہ سوچ رہے تھے کہ کیا کرنا چاہیے، جب انھیں خبر ملی کہ تاتار ان کے کئی سو میل پیچھے پہنچ گئے ہیں اور دارالسلطنت خوارزم خطرے میں ہے۔ چنگیز کی اس چال نے خوارزم کی فوج اور ریاست کو ختم کر دیا، تاتار ہر طرف پھیل گئے اور تہذیب کیا خود زندگی کے نقش مٹانے لگے۔ تباہی اور خوف کی اس فضا میں ایک جلال الدین ہی ایسا آدمی تھا کہ جس کی ہمت تاتاروں کا منہ چڑھاتی رہی، سلطنت اور فوج کے ہاتھ سے نکل جانے پر اس میں اتنی سکت کہاں تھی کہ تاتاروں کی روک تھام کر سکے، کسی میدان میں وہ چنگیز کے سامنے ٹھیر نہ سکا، مگر ہر جگہ جی توڑ کر لڑا، اور میدان چھوڑا تو یہ ٹھان کر کہ یہاں نہیں تو کہیں اور سہی، مگر جب تک جان میں جان ہے لڑتا ضرور رہوں گا۔ آخر میں دریائے سندھ کے کناروں پر چنگیز خاں نے اسے گھیر لیا، اس کے ساتھ جو تھوڑے سے سپاہی تھے وہ سب مارے گئے اور وہ خود زخمی ہوا۔ جب کوئی چارہ نہ رہا تو جلال الدین دریا میں کود پڑا اور تیر کر اس پار پہنچ گیا۔ معلوم نہیں چنگیز خاں کو اس پر ترس آیا، اسے اطمینان ہو گیا کہ اب وہ مقابلہ کرنے کے لائق نہیں رہا ہے، یا ہندوستان کی تقدیر نے

اس کی تدبیروں کو کسی اور طرف پھیر دیا۔ بہرحال وہ دریا کے اس پار نہیں آیا۔

تاتاروں کا ایک حصہ ترکستان سے جنوب کی طرف آیا، دوسرا مغرب کی طرف بھیجا گیا، اور اس نے جنوبی روس، پولینڈ اور ہنگری کو فتح کیا چنگیز خاں نے قراقرم کے شہر کو اس وسیع سلطنت کا مرکز بنایا، لیکن ایسی سلطنت پر ایک جگہ سے حکومت کرنا ممکن نہیں تھا، پچاس برس کے اندر اس کے کئی حصے ہو گئے، اور تاتار سرداروں نے آپس میں لڑنا بھی شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان تہذیبوں نے جن کو مٹانے کے لئے وہ نکلے تھے انھیں رام کر لیا، مگر تاتاروں میں اجاڑنے کا شوق تھا، بسانے کا سلیقہ نہیں تھا۔ ایران کے جو شہر انھوں نے برباد کئے وہ اب تک موت کی نیند سو رہے ہیں، جن نہروں کو انھوں نے پاٹا وہ پھر کبھی زمین کی پیاس بجھانے کو نہیں نکلیں، جن کھیتوں اور باغوں کو انھوں نے جلایا وہاں پھر کبھی زمین کو سبزے کی چادر نصیب نہ ہوئی۔ چودھویں صدی کے آخر میں تاتاروں کے ایک سردار امیر تیمور کو چنگیز خاں کی سی سلطنت قائم کرنے کی ہوس نے ابھارا، اور اس میں شک نہیں کہ لڑائی کے فن میں وہ چنگیز خاں کی سی قابلیت رکھتا تھا۔ چنگیز خاں نے قراقرم کی رونق بڑھانے

مسلمانوں کی تاریخ پر سرسری نظر



کے لئے دنیا کو ویران کیا تھا، تیمور نے سمرقند کو سنوارنے کے لئے مسلمانوں کے ہر ملک اور شہر کو ماتم کدہ بنا دیا۔ فرق بس یہ تھا کہ چنگیز خاں نے امیر کو لوٹا، تیمور نے غریب کو، چنگیز نے زندہ کو مارا، تیمور نے مردے کو۔

مسلمانوں کے تہذیبی مرکز، عراق اور ایران کے لئے یہ ایک آفت کا زمانہ تھا، جب ایک بلا کا ٹلنا دوسری کے آنے کا سندیس تھا، بازار لٹے پڑے تھے، صنعت اجڑ گئی تھی، غریب کا سہارا محنت پر نہ تھا بلکہ امیر کی پرورش پر، ہر طرف لوگ دنیا کے کروٹیں بدلنے سے بے چین تھے، اس کے دھوکوں سے بیزار تھے، تقدیر کا تدبیر کی کاٹ کرنا زندگی کا اٹل قانون معلوم ہوتا تھا۔ ایسے زمانے میں تہذیب کا پلٹا کھانا ضروری تھا۔ کوئی تعجب نہیں کہ ہم اس زمانے میں دنیا اور دین کو الگ ہوتے دیکھتے ہیں، دنیا میدان عمل نہیں رہتی، مایا اور سنسار بن جاتی ہے، دین اخلاق اور حوصلے کا سرچشمہ نہیں رہتا، دینیات اور قانون کا دفتر بن جاتا ہے، علم کو ترقی دینے کی کوشش پر بزرگوں کی توہین کا شبہہ کیا جاتا ہے، اور ہنر امیروں کے دروں پر بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ اس زمانے میں کامیابی اس کا حصہ سمجھی جاتی ہے جو شیخ سعدی کی گلستاں کی حکایتوں اور نصیحتوں سے فائدہ اٹھانے کا سلیقہ رکھتا ہے، زاہد کی قانون پرستی

اور دنیا دار کی مصلحت بینی انسانیت سے دور بھی جاتی ہے، کمال کا تصور بھلا دیا جاتا ہے، جمال کی صورت تکی جاتی ہے، سعدی کی گلستاں کا جواب حافظ کا دیوان ہے، شیخ کے قانون کا توڑ میکدوں کی آزادی۔

جس زمانے میں سعدی اور حافظ جیسے ادیب پیدا ہوں اسے خالی کہتے برا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں، جو تاتاری حملوں سے شروع ہوا تہذیب کے پرانے مرکزوں پر مردنی چھائی رہی۔ اس زمانے میں زندگی اور عمل کے آثار نظر آتے ہیں تو ترکی اور ہندوستان میں، اور یہاں کی جو کارگذاری ہے وہ بھی سیاسی ہے تہذیبی نہیں۔

ترکی سلطنت کی بنیاد ایک قبیلے نے رکھی جو اپنے پہلے مسلمان سردار کے نام سے عثمان لی یا آلِ عثمان کہلاتا تھا۔ اس قبیلے کو تین چار سو برس تک برابر نہایت ہوشیار سردار ملتے رہے، جنھوں نے آہستہ آہستہ سارے اناطولیہ پر قبضہ کر لیا، اور پھر سمندر پار کر کے یورپ پر بھی حملے شروع کئے۔ ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کو جو ترکوں کی سلطنت میں ایک ذرا سا جزیرہ بن کر رہ گیا تھا فتح کیا۔ اس کے لڑکے

نے پولینڈ تک لشکر کشی کی، اور اس کے پوتے سلیم نے فرات کی وادی، شام، فلسطین اور مصر کو ترک سلطنت میں شامل کرلیا۔ سلیم کے لڑکے سلیمان اعظم کا زمانہ (۱۵۲۰ء سے ۱۵۶۶ء) ترکوں کے انتہائی عروج کا وقت تھا جب ان کی حکومت آسٹریا کے دارالسلطنت ویئنا سے لے کر بصرے تک اور پولینڈ سے نیل کی وادی کے جنوبی سرے تک پھیل گئی تھی۔

جب عرب اپنے اخلاق اور اپنی تہذیب کے باوجود یورپ میں بدنام کیے گئے تھے تو یہ بھلا کب ممکن تھا کہ ترک، جنھوں نے کئی بار جنگ اور سیاست کے میدان میں یورپی قوموں کو پچھاڑا تھا بدنامی سے بچتے یورپ والے ترک سپاہیوں کا لوہا ماننے پر تو مجبور ہوئے لیکن اس کے سوا ترکوں کی کسی اور صفت کا انھوں نے چرچا نہیں ہونے دیا، بلکہ ساری دنیا میں یہ مشہور کیا کہ ترک وحشی، جاہل بداخلاق اور کٹر لوگ ہیں، تلوار کے بل پر لوگوں کو غلام بناتے رہتے ہیں، اور ان سے کسی قوم کی آزادی اور آبرو محفوظ نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک ترکوں کی حکومت میں بگاڑ پیدا نہیں ہوا، وہ اپنے زمانے کی بہترین حکومت تھی ترک حکمرانوں نے یہ دیکھ کر کہ ان کی سلطنت میں بہت سی قوموں اور مذہبوں کے لوگ ہیں اپنی رعایا کو ملتوں، یعنی مذہبی سماجوں میں تقسیم کر دیا، اور ہر

سماج کو پوری آزادی دیدی کہ اپنے مذہبی رہنماؤں کے ماتحت رہے، اپنے لئے قانون بنائے، اور اپنے بچوں کو اپنے مذہب کی تعلیم دے انھیں ملتوں میں سے ایک مسلمان بھی تھے، مذہبی سماج کی حیثیت سے وہ سلطان کے نہیں بلکہ شیخ الاسلام کے ماتحت تھے، اور یہی شیخ الاسلام دوسری مذہبی سماجوں کے حقوق کی بھی حفاظت کرتے۔ فوج براہ راست سلطان کے ماتحت تھی، اور فوج اور سرکاری ملازمت کے لئے جو نوجوان بھرتی کئے جاتے ان کی تعلیم کا انتظام ریاست خود کرتی اور ان کا تمام خرچ برداشت کرتی تھی۔ لیکن اس خیال سے کہ یہ لوگ اپنے بھائی بندوں کی خاطر ریاست کا حق نہ ماریں وہ اپنے خاندانوں سے بالکل الگ کر دئے جاتے اور ریاست کے سوا ان کا کسی سے ناتا رشتہ نہ ہوتا تھا جیسے سیاست میں ہر قوم اور مذہب کا لحاظ کیا گیا ویسے ہی تجارت میں بھی ہر ملک کے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی دی گئی۔ مختلف قوموں کے جو تاجر قسطنطنیہ میں کاروبار کرتے تھے انھیں اس کا حق تھا کہ اپنے سفیروں کو اپنا نگراں اور ذمہ دار بنائیں، ان کے آپس کے معاملات ان کی اپنی عدالتوں میں پیش ہوں اور دوسروں سے کوئی جھگڑا ہو جائے تب بھی فیصلہ کرتے وقت ان کے اپنے یہاں کے قاعدے اور رسم و رواج کا خیال کیا جائے۔



مصر کے اسلامی فن تعمیر کا ایک نفیس نمونہ

اس طرح ترکوں کی حکومت ایک طرف تو نہایت مضبوط اور طاقت ور شاہی حکومت تھی، دوسری طرف ایک بین الاقوامی حکومت جس میں سب کا حق برابر تھا، سب کی حیثیت برابر۔

ترکوں نے جب حکومت کے یہ اصول بنائے تو یورپ والے خاصی ترقی کر چکے تھے مگر ان میں تنگ نظری اتنی تھی کہ وہ عیسائیوں کو جن کے عقیدے یا دریوں کو غلط اور ناگوار معلوم ہوتے زندہ جلا دینا ضروری سمجھتے تھے، اور وہ دن تو آئے ہی نہیں تھے جب ہر ملک میں اسی تنگ نظری اور تعصب کی وجہ سے خانہ جنگیاں اور خونریزیاں ہوئیں، رومی کلیسا نے گمراہوں کو جلانے کے لئے ایک خاص محکمہ قائم کیا اور ہسپانیہ میں رعایا بددل ہو جاتی اگر اسے چار پانچ دن تک کسی بے دین کے جلنے کا تماشہ دیکھنے کو نہ ملتا۔ کیتھلک اور پروٹسٹنٹ ڈیڑھ سو سال تک اس طرح ایک دوسرے کو جلاتے رہے، اور اس کے ساتھ ہی لاکھوں عورتیں بھی جلائی گئیں جن پر جادوگرنیاں ہونے کا شبہہ کیا گیا۔ لیکن ستم ظریفی دیکھئے کہ یہی لوگ ترکوں کو، جنھوں نے ایک عیسائی کو بھی بے دین سمجھ کر ستایا نہ ہوگا وحشی، ناپاک اور ظالم کہتے تھے۔

اصل میں زبان سے وہ چاہے جو کچھ کہتے ہوں، دل میں تو پند کھوئے

اور سولھویں صدی تک یورپ کے بادشاہ کچھ اور سمجھتے تھے۔ وہ سب کے سب اس فکر میں لگے رہتے تھے کہ ترکی کے سلطان سے تعلقات بڑھائیں اور ہو سکے تو اپنے جھگڑے چکانے کے لئے اس کی مدد حاصل کریں۔ فرانس کے ایک بادشاہ نے سلطان کو عیسائی ملت کے سردار پاپائے روم کی مخالفت پر آمادہ کرنا چاہا، اور انگلستان کی ملکہ ایلزبتھ نے ہسپانیہ کے بادشاہ فلپ کے پنجے سے بچنے کے لئے سلیمان اعظم سے جس طرح گڑگڑا کر مدد مانگی وہ تو ایسا شرمناک واقعہ ہے کہ انگریز مورخ اس کا کہیں ذکر ہی نہیں کرتے۔

ترکوں کی سیرت میں شاید یہ کمی تھی، یا حکومت کا انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا اس کا یہ ایک نتیجہ تھا کہ علم اور ادب میں اُنھوں نے نام پیدا نہیں کیا۔ ان کے یہاں شاعر اور ادیب ہوگئے مگر وہ عرب اور ایرانی استادوں کی نقل کر کے رہ گئے، اور علم میں وہ اس سے بھی زیادہ پیچھے رہ گئے۔ اگرچہ فن تعمیر میں وہ دنیا کی کسی قوم کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے، مگر علم آتا بھی تو کہاں سے۔ مسلمان تازہ غور و فکر کا حوصلہ چھوڑ کر اپنے علم کا دفتر بند کر چکے تھے، ادھر یورپ میں تعصب اور جہالت کے سوا کچھ تھا ہی نہیں اور تھا تو کلیسا کے ڈر سے اپنا منہ چھپائے تھا۔ جس فصل میں سبھی کی کھیتی خراب ہو کسی ایک پر بے پروائی کا الزام لگانے سے کیا فائدہ۔

(۱۴)

ہندوستان (۷۰۰-۱۸۰۰)

قدرت نے ہندوستان کو بڑے پیمانے پر بنایا ہے۔ اسی پیمانے کی مناسبت سے اس کو طرح طرح کی فضاؤں سے، رنگ برنگی طبیعتوں سے، حقیقتوں اور افسانوں سے آباد کیا ہے۔ یہ ایک دیس بھی ہے اور ایک دنیا بھی، اور دنیا ایسی کہ جس میں وہی چیزیں جو میل نہیں کھاتیں یک جا کر دی گئی ہیں۔ اس ملک کی جتنی کہانی آپ سن چکے ہیں اس میں کبھی ایک راج، ایک دیس کے خیال نے اس کا بل بوتا اتنا بڑھا دیا کہ آدھی دنیا میں اس کا سکہ چلتا تھا کبھی اس کے سینکڑوں راج اور سینکڑوں دیس ہو گئے اور اس کی بے بسی دیکھ کر جس نے چاہا اس کی دولت لوٹی، جس نے چاہا اس کا مالک بن بیٹھا۔ اس نئے دور میں جس کی کہانی اب شروع ہوتی ہے قدرت نے یہ نیا کھیل کھیلا کہ

ہندوستان کو متحد کرنے اور اسے آنے والی مصیبتوں سے بچانے کے لئے ایسے
لوگوں کو بھیجا جو ہندوستانی نہیں تھے، جن کے مذہب اور چال ڈھال سے
ہندوستان بالکل ناآشنا تھا، جو اگر کامیاب ہوتے تو ان کا کوئی احسان نہ مانتا
کہ وہ پردیسی تھے اور بن بلائے آئے تھے، اور اگر ناکامیاب ہوتے تو اس
ملک میں جہاں پہلے کچھ کم بکھیڑے نہ تھے، ایک اور بکھیڑا بڑھ جاتا۔

ان نئے لوگوں کی اصل خصوصیت یہ تھی کہ وہ مسلمان تھے۔ ان کی نسل
کو دیکھئے تو سب سے پہلے آنے والے عرب تھے۔ یہ تجارت کرتے تھے،
کاروباری تھے، اس لئے ان کی خاصی آؤ بھگت کی گئی اور مغرب اور
جنوب میں سمندر کے کنارے جو شہر تھے ان میں انھوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی
بستیاں بھی بسالیں۔ تجارت اور آبرو بچانے کے لیے انھیں سندھ کی
راجپوت ریاست سے لڑنا پڑا، مگر انھوں نے سندھ کے آگے اپنے قدم
نہیں بڑھائے۔ ہندوستان پر حکومت کرنے کی انھیں خواہش نہ تھی،
تجارت، تہذیب یا مذہب پھیلانے کا جو کام انھوں نے کیا وہ بہت
خاموشی سے۔ لیکن حقیقت کو دیکھئے تو جنوبی ہندوستان کے عربوں
نے جو اثر ہندوستانی زندگی پر ڈالا اس کی مثال شمالی ہند کی مسلمان ریاستوں
کی ساری کارگذاری میں بھی نہیں ملتی، اور ہندو سماج میں انھوں نے

جو ہل چل پیدا کی وہ ملک کی فتح اور غیروں کی حکومت بھی پیدا نہ کر سکی۔ آٹھویں صدی سے بارھویں تک جنوبی ہند سے اصلاح کی جو تحریکیں اٹھیں، وہ تحریکیں جنھوں نے بدھ مت، جین مت، شومت اور وشنومت کو ملا کر ہندو دھرم بنا دیا، جنھوں نے جاتروں کی رسم قائم کرکے اور ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے تک لوگوں کو ثواب کمانے کے لئے بھیج کر دینی اور معاشرتی اتحاد کا ایک خیال پیدا کیا جو پہلے کہیں اور کبھی نظر نہیں آتا، وہ تحریکیں جنھوں نے ذات کی دیواروں کو پھاند کر ہندو دھرم کو جنتا کا دھرم بنا یا یہ سب عربوں کی تبلیغ اسلام، ان کے دینی جوش، ان کی آزادی اور مساوات کا جواب تھا۔

عربوں کے بعد جو مسلمان ہندوستان آئے وہ ترک تھے اور ان کے آنے کی شان اور تھی۔ ان کا حال تو اس مثل سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرتا کیا نہ کرتا۔ ان کے اپنے دیس یعنی دریائے اورخون اور اس کے آس پاس کی وادیوں میں آبادی بہت بڑھ گئی تھی، اور ان کے قبیلے ایک دوسرے کو ادھر اُدھر ڈھکیل رہے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ دوسری صدی قبل مسیح میں یہیں سے ایک نسل گھر چھوڑ کر نکلی تھی، اور اس کے ایک قبیلے کے سرداروں نے جو کشن کہلاتا تھا ایک بہت بڑی سلطنت قائم کی تھی جس کی راجدھانی پیشاور کا شہر تھا اور جس میں شمالی ہندوستان کا بہت بڑا حصہ شامل تھا۔

پنجاب، سندھ، گجرات اور شمالی مہاراشٹر میں اس نسل کے بہت سے لوگ بس بھی گئے تھے۔ نویں صدی میں ہم پھر اس طرف سے ترک قبیلوں کو برابر ترکستان اور ایران کی طرف بڑھتے دیکھتے ہیں۔ اپنے دیس سے وہ پہلے اس طرح نکلے جیسے گھڑے سے پانی رس کر باہر نکلتا ہے، اور مسلمانوں کی آبادی میں گھل مل گئے۔ لیکن یہ سب جانتے تھے، اور سب سے بہتر خود یہ ترک، کہ گھڑا ایک نہ ایک دن پانی کے زور سے پھوٹ جائے گا۔ محمود غزنوی (۹۹۸۔۱۰۳۰) اپنے سامنے ترک قبیلوں کو دھکا پیلی کرتے دیکھ رہا تھا، اور اس کی سیاست ایک طرف شہرت کی آرزو تھی تو دوسری طرف خطرے سے بچنے کی تدبیر بھی تھی۔ اس نے اپنا گھر بار بچانے کے لئے دوسرے کا گھر لوٹا۔ لیکن اس کے مرتے ہی جو کچھ سرمایہ اس نے چھوڑا تھا وہ اِدھر اُدھر ہوگیا، اور وہی سیلاب جسے وہ روکنا چاہتا تھا خراسان اور ایران سے موجیں مارتا ہوا عراق تک پہنچا۔ محمود کے جانشینوں نے غزنی چھوڑ کر پنجاب میں پناہ لی، اور ان کے بعد غوری بھی انھیں کی طرح ایک کے بعد ایک مورچے سے نکالے گئے۔ ان کے لئے بھی بس ایک سہارا تھا، وہ یہ کہ ہندُستان میں کسی طرح اپنے قدم جمائیں۔

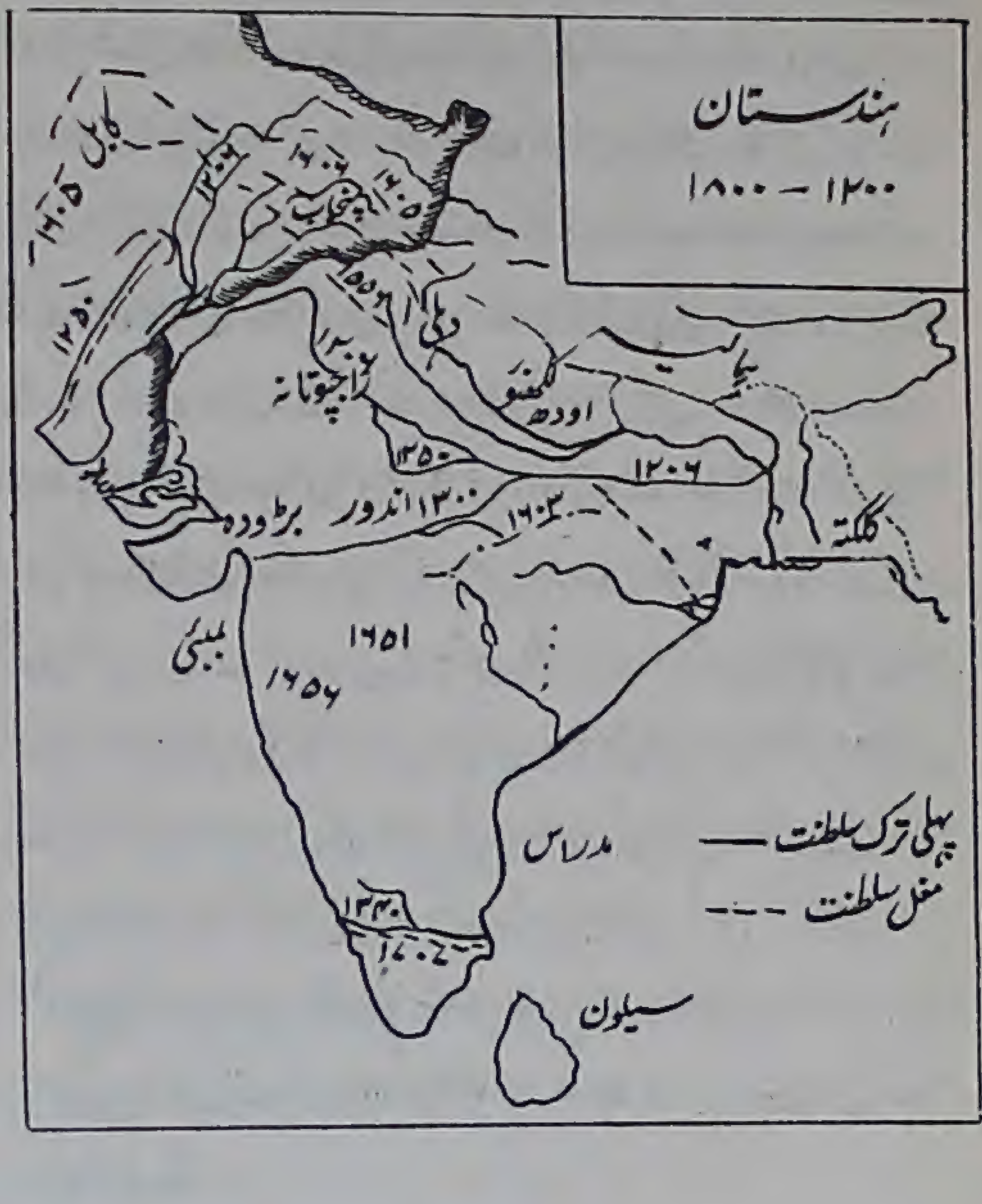
یہ سب دیکھتے ہوئے آج کل محمود یا شہاب الدین کو برا کہنا ٹھیک ہو

نہ ان کے گن گانا۔ جو لوگ دنیا کو ایک حال میں دیکھنا چاہتے ہیں ان کی تو جانئے قسمت میں کڑھنا لکھا ہے، وہ اس بات پر نہیں تو کسی اور پر اپنا بھی دل جلائیں گے، پر وہ جو سمجھتے ہیں کہ زندگی نام ہے کشمکش اور طوفان اور انقلاب کا وہ لڑائیوں اور خونریزیوں کا گلہ نہ کریں گے، بلکہ یہ دیکھیں گے کہ ان کی بدولت ایک نیا حوصلہ اور نیا دین ہندوستان میں آیا اور یہاں کے میدان اور پہاڑ ایک نئی زندگی کے ہنگاموں سے گونج اٹھے۔

مسلمانوں کے آنے سے پہلے بھی ہندوستان ایک راج، ایک دیس رہ چکا تھا، مگر اتحاد کا جو حوصلہ ترک اپنے دلوں میں لائے وہ کچھ اور ہی تھا۔ وہ سارے ملک پر ایک جگہ سے حکومت کرنا چاہتے تھے، ان کے جسم کے ٹکڑے ہو جاتے مگر وہ اپنی ریاست کے ٹکڑے نہ ہونے دیتے، اور اپنا راج جو کوئی بھی اس معاملے میں ضد کرتا اسے وہ زندہ نہ چھوڑتے۔ سارا ہندوستان ان کے قبضے میں نہیں آیا، لیکن جہاں تک ان کا بس چلا انھوں نے متحد ریاست کی خاطر مقام اور نسل اور مذہب کا فرق مٹا دیا، حکومت کا حق سب پر برابر رکھا، حکومت پر سب کا حق برابر، چاہے وہ قریب کے لوگ ہوں یا دور کے پنجاب کے یا بنگال یا گجرات کے، حکومت کا جو دشمن ہوتا اسے وہ دشمن سمجھتے تھے، چاہے وہ مسلمان ہوتا یا ہندو، اسی طرح وہ دوستی کا حق بھی ادا کرتے،

اور اس میں بھی انھیں نسل اور مذہب سے کوئی مطلب نہ تھا۔ ان کا حوصلہ کسی ایک شخص کا حوصلہ نہیں تھا، بلکہ ان تمام لوگوں کا جو سمجھ دار تھے اور خود غرض نہ تھے، اس میں سمجھئے ان کے دل اور دماغ ڈوبے ہوئے تھے۔ ہندوستان میں آتے ہی اُنھوں نے ریاست کی بنیاد رکھی، اور اسے بڑھانے اور مضبوط کرنے میں مشغول ہوگئے۔ ڈیڑھ سو برس کے اندر اُنھوں نے پشاور سے ملابار تک اور بلوچستان سے آسام تک اس ریاست کو پھیلایا، لیکن آخر میں یہ بوجھ اتنا بڑھ گیا کہ ان کے کندھے اسے سنبھال نہ سکے وہ لڑکھڑا کر گرے اور ان کی ریاست کے کئی ٹکڑے ہوگئے۔ پھر پٹھان، جن کو یہ حوصلہ ورثے میں ملا، اسے پورا کرنے کی کوشش میں لگ گئے شیر شاہ کے زمانے میں شمالی ہندوستان پھر ایک چتر کے سائے میں آگیا، اور جب پٹھانوں کی ہمت جواب دینے لگی تو مغلوں نے آکر کندھا دیا۔ اکبر کے زمانے سے مسلمانوں کی ریاست کا دوسرا دور شروع ہوا۔ یہ دوسری ریاست بھی پورے ہندوستان کو ایک راج اور ایک دیس بنانے کی کوشش میں پھلی پھولی بھی اور تباہ بھی ہوئی، اور ترکوں کی طرح مغلوں کو بھی اتحاد کی آرزو نے کامیابی کے عروج پر پہنچایا اور پھر اسی نے ان کو مٹا بھی دیا۔

ہندوستان کے ایک ملک، ایک ریاست بنانے کا حوصلہ



ہندستان
۱۲۰۰ — ۱۸۰۰
کابل
پنجاب
دہلی
راجپوتانہ
لکھنؤ
اودھ
بہار
کلکتہ
اندور
بڑودہ
بمبئی
مدراس
سیلون
پہلی ترک سلطنت
مغل سلطنت
۱۶۵۱
۱۶۵۶

مسلمانوں کو تھا، چاہے وہ ترک ہوں یا پٹھان یا مغل، اس کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ اس کے پیچھے اُنھوں نے اپنا پسینہ بھی بہایا اور خون بھی اور بہت سی عداوتیں مول لیں جو اس وقت تک رنگ لا رہی ہیں۔ اس سے جو فائدہ پہنچا وہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس حوصلے نے جنگل کٹوائے، ایسی سڑکیں بنوائیں جو ہندوستان کو ایک سرے سے دوسرے تک ناپتی تھیں اور ان کے تاگوں میں سرائے اور ڈاک چوکی، قصبے اور شہر کے دانے پروئے، اس نے تھانے اور چھاؤنیاں بنوائیں، اور حکومت کا وہ ڈھانچہ تیار کیا جو اب بھی اسی طرح کھڑا ہے، اور صنعت، معاشرت، تہذیب سب میں ایک ہی دُھن پیدا کردی۔ ترکوں میں یہ حوصلہ نہ ہوتا تو ہندوستان کوئی اسّی برس تک تاتاروں کے ہاتھوں لٹتا رہتا، اور آپ جاننا چاہتے ہوں کہ یہ بربادی کیسی ہوتی تو ترکستان، ایران اور عراق میں ان خونخوار وحشیوں نے جو ستم ڈھایا اس کی رام کہانی ان ملکوں کی تاریخ سے سُن لیجیے۔ مغلوں میں یہ حوصلہ نہ ہوتا تو اس وقت ہندوستان پرتگالی، ڈچ، فرانسیسی اور انگریزی نوآبادیوں اور مقبوضات کا چرچا نہ ہوتا، وہ تہذیب اور وہ زبان نہ ہوتی جو اس وقت ہمارے اتحاد کا سہارا ہے، اور ہم اپنی تاریخ کے نام سے شرماتے۔

اتحاد کا یہ حوصلہ خالی سیاسی اتحاد کا حوصلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ترکوں اور مغلوں کو ایک ٹھکانے کی تلاش تھی۔ ہندوستان کو اُنھوں نے اپنا وطن بنایا، اور یہ سمجھ کر رہے کہ یہاں سے بس اب جائیں گے تو اپنے خدا کے پاس جائیں گے۔ ان کی سرکاری زبان تو فارسی رہی، لیکن بول چال کے لئے اُنھوں نے یہاں کی زبانیں سیکھیں، ان میں سے ہر ایک کو ادبی زبان کا مرتبہ دیا، اور شمالی ہندوستان کی بھاشاؤں کو ملا کر ایک ایسی زبان بنائی جو قومی زبان کہی جا سکتی ہے۔ وہ ایسے اوچھے نہ تھے کہ ہر بات میں نقل کرتے، اور تنگ دل نہ تھے کہ دوسرے کی اچھی چیز کو پسند نہ کرتے۔ ہندوستان آتے ہی یہاں کی فضا ان کے دلوں میں سما گئی، زبان کی طرح یہاں کے ہر فن کی انھوں نے قدر کی، ہر صنعت کو ترقی دی، اپنے مذاق کو یہاں کے مذاق میں سمویا، اور ہر چیز میں ایک وضع نکالی جسے ہم ٹھیٹھ ہندوستانی کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہندو مسلم مذاق کا یہ میل امیر خسرو کی ملی جلی فارسی ہندی نظموں، ان کی غزلوں اور پہیلیوں سے شروع ہوتا ہے، جب ترکوں کو آباد ہوئے تین پشتیں بھی نہیں گذری تھیں، اور اب وہ ہماری طبیعت اور عادت میں اس طرح کھپ گیا ہے کہ اس پر میل کا شبہہ بھی نہیں ہوتا۔ انگریزی تعلیم، یورپی تہذیب اور اس تجارتی مال نے جو اس یقین کے ساتھ ہمارے بازاروں میں بھر دیا جاتا

ہے کہ ہم اسے جھک مار کر خریدیں گے، ان باتوں کو بھلا دیا ہے جو ہندوستان کو اس خالص ہندوستانی تہذیب نے سکھائیں، ان چیزوں کو ہماری نظر سے چھپا دیا جو اس نے بنائیں۔ ہم بھول گئے ہیں کہ دری اور قالین چلمن اور پردہ، حوض، فوارہ اور چبوترہ، سلفچی، دسترخوان اور پلیٹیں، لوٹا اور صراحی جوتے اور ٹوپی اور سلے ہوئے کپڑوں کا عام رواج، ہاتھ ملانے اور گلے ملنے کی رسم، مکان کی وہ تقسیم کہ جس میں ملاقات کے لئے الگ حصہ ہوتا ہے اور خلوت کا الگ، وہ صحبتیں کہ جن میں غیروں کی قدر اپنوں سے زیادہ کی جاتی ہے، وہ دعوتیں کہ جن میں ہر ذات اور پیشے کے لوگ ایک جگہ بیٹھ کر کھاتے ہیں، تعلیم حاصل کرنے کا عام حق، اپنے جوہر دکھانے کا سب کے لئے موقع، یہ ساری باتیں مسلمانوں کے ساتھ آئیں اور ہندوستانی تہذیب میں کھپا دی گئیں۔ نئی چیز کا شوق بھی انھیں نے پیدا کیا۔ دھوتی اور ساری ہزاروں برس ہندوستان کا پہناوا رہا، اور ذرا بھی نہ بدلا، لیکن مسلمانوں کے آنے کے بعد دیکھئے تو ہر نئی پشت ہندوستانی پہناوے کو بدلتی ہے اور ایک نئی وضع نکالتی ہے۔ رہن سہن میں بھی تکلف اور نفاست میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی، اور گھریلو زندگی اور میل جول ہر ممکن طریقے سے سنوارا گیا۔

لیکن یہ ہندوستانی تہذیب ایک دکھاوا رہتی اور کھوکھلی ہوتی اگر



قوالی

مذہب اس میں جان نہ ڈالتا۔ نئی تعلیم نے ہم کو یہ پٹی پڑھائی ہے کہ مسلمانوں نے جیسے زبردستی اپنی حکومت قائم کی ویسے ہی اپنے دین کو بھی پھیلایا، اوران کا چلن ایسا تھا کہ جن ہندوؤں کو اپنے دھرم اور قومی آبرو کا خیال تھا وہ ان سے الگ رہے۔ اس کے علاوہ آج کل کی سیاست یہ سبق پڑھا رہی ہے کہ مذہب ہمیشہ لڑاتا ہے، کبھی ملاتا نہیں۔ اب ہم کو اس بھائی چارے کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے جو صوفیوں اور جوگیوں، شاعروں اور بھگتوں کے خلوص اور صفائی کا عکس تھا، اور جس کا اجالا اب تک ہماری زندگی کی رونق ہوتا اگر ہم نے اسے اپنی خود غرضیوں پر قربان نہ کر دیا ہوتا۔ اس بھائی چارے کی بنیاد خواجہ معین الدین چشتی نے رکھی، جب وہ اجمیر آئے اور اچھوتوں میں رہ کر اور ان کی خدمت کر کے اسلامی مساوات کا پیغام سنایا۔ ان کے بعد ان کے سچے پیرو اسلامی اخلاق برتتے رہے، ان میں اتنی رواداری تھی کہ دینداری اور دل کی صفائی کو جہاں بھی دیکھیں اس کی قدر کریں، ان میں علم اور تجربہ حاصل کرنے کا ایسا شوق تھا کہ یوگ اور گیان بھگتی اور دھیان سب ستوں پر چل کر اس آخری منزل تک پہنچنے کی کوشش کریں کہ جس کے آگے بس خدا کی ذات ہے۔ ان صوفیوں کے اپنے حلقے تھے جن میں ہندو مسلمان دونوں شریک ہوتے تھے، اور روحانی یک جہتی کا یہ ایک بے مثل نمونہ تھا۔

اسلام جہاں پھیلا صوفیوں کی بدولت پھیلا لیکن یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ ان کے اثر سے ہندوؤں کے اپنے عقیدے بھی پختہ ہوئے۔ اُپنشدوں اور بھگوت گیتا کی تعلیم، یوگ اور فلسفے سے ان کو ایک نیا لگاؤ ہو گیا، انھوں نے اپنے دھرم کی تعلیم کا پرچار کیا اور اس علم کو جواب تک برہمنوں کے یہاں کتابوں میں بند پڑا تھا ہندوؤں کی پوری سماج میں دل کھول کر تقسیم کیا۔ تلسی داس جی کی راماین نے کیا تو رام چندر جی کا چرچا۔ لیکن وہ ہندی میں کبھی یہ لکھتے اگر مسلمانوں نے اس زبان کو آبرو نہ دی ہوتی اور یہ خیال ہر ایک کے دل میں بٹھا نہ دیا ہوتا کہ دین کی دولت پر سب کا حق برابر ہے۔

ہندو مسلمان کے میل جول سے کوئی نیا مذہب بنا اور نہ بننا چاہیے تھا۔ لیکن جیسے صنعت، فن تعمیر، موسیقی اور دوسرے فنون لطیفہ میں دونوں کے مذاق نے مل کر ایک معیار قایم کیا، جیسے دونوں کے میل ملاقات نے گفتگو اور صحبت کے آداب مقرر کیے، ویسے ہی ان کے دلوں نے مل کر انسانیت کا ایک تصور بنایا جس کے سامنے سب کے سر جھکتے تھے اور جو سب کو برابر عزیز تھا۔ انسانیت کا یہ تصور اس زمانے میں ایک سہارا تھا جب کہ مغل سلطنت برباد ہو چکی تھی، اس پر اس وقت بھی اعتبار رہا جب لوگوں نے عام طور سے ایک دوسرے پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ تصور ہی تو بڑھاپے اور

زوال کی یادگار، لیکن یہ ہماری مشترک زبان اردو کا جوہر ہے اور اس کی تہذیبی قدر و قیمت ہماری بہترین فنی یادگاروں سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ اور کیا تعجب ہے اگر ہم غیریت اور عداوت کی تمام منزلیں طے کرنے کے بعد پھر اسی مقام پر پہنچیں جہاں سے ہم چلے تھے، اپنی آخری محفل کے اس چراغ کو پھر جلائیں، اس کی روشنی میں ایک کو دیکھیں اور پہچانیں اور ہمارے دلوں میں یہ پرانی، بھولی ہوئی محبت کی یاد پھر تازہ کر دے۔

(۱۴)

یورپی تہذیب کی ابتدا

اس وقت سے جب کہ عرب اسلام کا پیغام لے کر نکلے، کوئی ایک ہزار سال تک مشرق کے ابھرنے پھیلنے اور دنیا پر چھا جانے کا زمانہ ہے جب لڑائی اور تجارت میں ہر طرف مشرقی قوموں کی جیت رہی اور علم اور تہذیب میں ان کی عقل اور روشن خیالی دنیا کو ترقی کا رستہ دکھاتی رہی۔ سترھویں صدی کے آخر تک مشرق کی تہذیب سن سے اتر گئی تھی، ہر قوم میں بڑھاپے کے روگ نظر آرہے تھے، اور ادھر طبیعتوں کو سست اور ہاتھوں کو کمزور دیکھ کر مغرب کی قوموں نے دنیا کی حکومت چھین لی۔ اب یہ داستان سن لیجئے کہ دنیا کا جو نیا رنگ آپ دیکھ رہے ہیں یہ کب اور کس طرح جما۔

یورپ کی قومیں اپنے آپ کو عیسائی کہتی ہیں، اور اس لئے مناسب



روم میں عیسائی ملت کا مرکزی گرجا جو سینٹ پیٹر کے نام سے منسوب ہے

یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ داستان اس وقت سے شروع کی جائے جب عیسائی مذہب کا رومی سلطنت میں پرچار ہوا۔ اسے سب سے پہلے ان غریبوں اور غلاموں نے قبول کیا تھا جنھیں رومی حکومت اور تہذیب کی چکّی پیسے ڈالتی تھی اور انھیں تسلی دینے کے لئے اس مذہب میں بہت سامان تھا لیکن عیسائی رہنماؤں نے اپنی محنت اور قابلیت زندگی کو ایسی صورت دینے میں صرف نہیں کی کہ جس سے غریبوں کا کچھ بھلا ہو اور حاکموں اور امیروں کی ہوس جو اندھیر ڈھا رہی تھی اس میں کچھ کمی ہو۔ وہ اسے بہت زیادہ نیک اور ضروری کام سمجھتے تھے کہ حضرت عیسٰی کے خدا یا انسان، یا خدا اور انسان ہونے کا سوال طے کرلیں، اور اس سے جو وقت بچتا اس میں وہ رومی سلطنت کو بددعائیں دیتے۔ کہ جب تک وہ موجود تھی دنیا میں خدا کی حکومت قائم نہیں ہوسکتی تھی۔ ہمیں یہ ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم ہے کہ رومی سلطنت نے عیسائیوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا، اس لیے مذہب کی سچائی ثابت کرنے کے لئے اس زمانے میں بے دھڑک جھوٹ بولا گیا، اور عیسائی فرقوں کے سردار ایک دوسرے کو جس طرح گالیاں دیتے تھے اور بدنام اور ذلیل کرنا چاہتے تھے اسے دیکھتے ہوئے ان کی کسی بات پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ عیسائی مذہب کو بھی دنیا سے اور دنیا کی تمام قوموں اور تہذیبوں سے، ایسی کٹر دشمنی تھی کہ جب پر اس وقت کے گرا

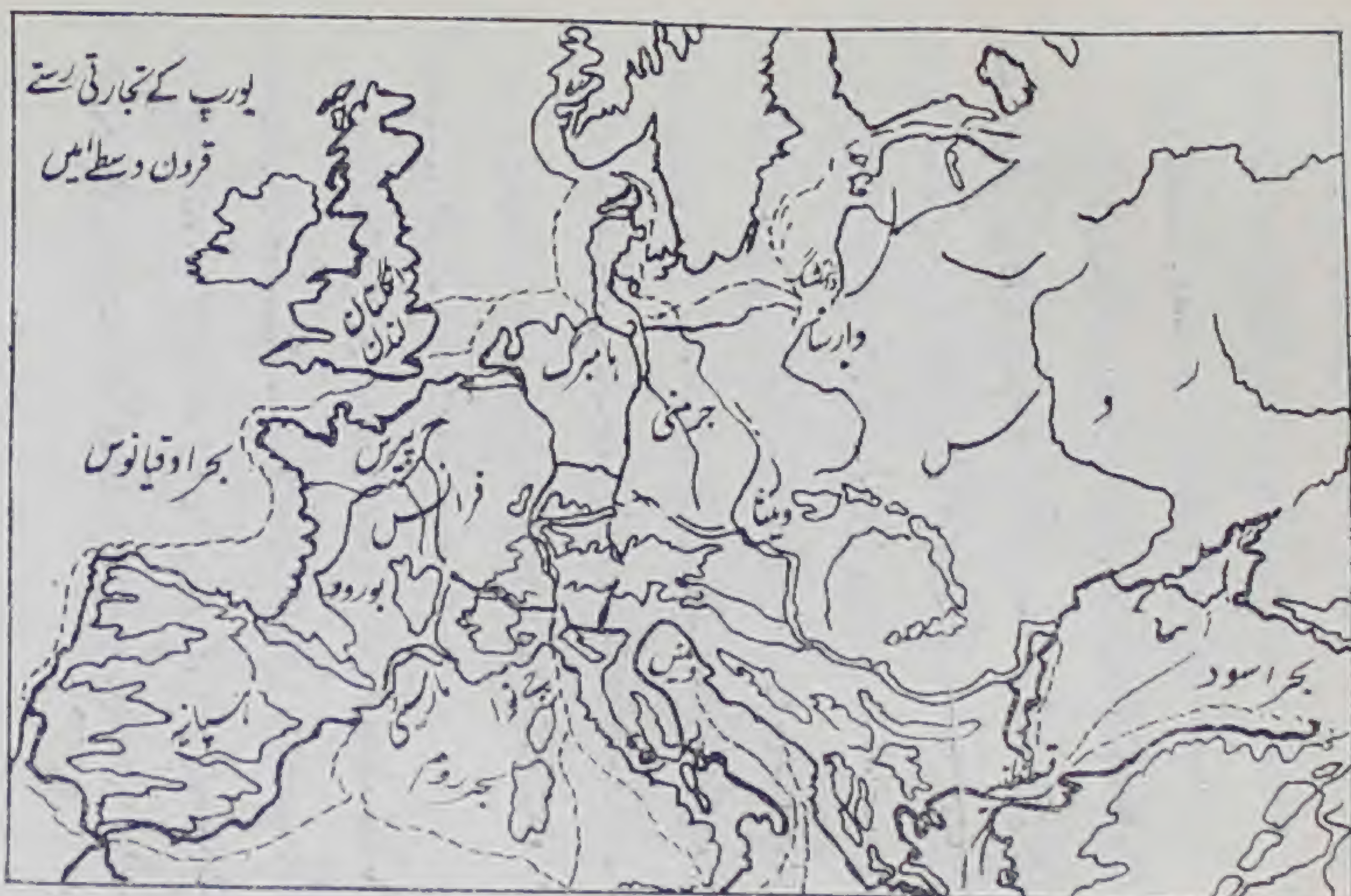
بے دین ، جھوٹے دیوتاؤں کو پوجنے والے رومی دنگ رہ جاتے تھے ، اور عیسائیوں پر اگر سختیاں بھی کی گئیں تو ان کا بہت بڑا سبب یہ تھا کہ رومی انھیں اپنے مذہب کے نہیں بلکہ خود آدمیت کے بدخواہ جانتے تھے ، جن کی ہر وقت یہ دعا رہتی تھی کہ خدا کا عذاب نازل ہو اور دنیا جل کر خاک ہو جائے ۔

لیکن اپنے عیبوں اور آپس کی لڑائیوں کے باوجود عیسائی جماعت بڑھتی رہی ۔ رومی سلطنت اور رومیوں کی طبیعت میں بگاڑ پیدا ہو گیا تھا شمال کی طرف سے وحشیوں کا دباؤ دن بدن بڑھ رہا تھا ، اور چوتھی صدی کے شروع میں شہنشاہ قسطنطین نے ، یہ سوچ کر کہ شاید اسی تدبیر سے سلطنت سنبھل جائے عیسائی مذہب کو سرکاری مذہب بنا دیا ۔ لیکن اسے بڑی مایوسی ہوئی ، اس لئے کہ جہاں اور مشکلیں تھیں وہاں یہ ایک کٹھن ذمہ داری اور بڑھ گئی کہ عیسائی فرقوں کو ایک دوسرے کے پنجے سے بچایئے ، ایک دوسرے کو مارنے اور جلا ڈالنے سے روکیئے ۔ عیسائیت کو اب غریبوں سے بھی کوئی لگاؤ نہ تھا ، کہ اسی قسطنطین نے ٹیکس بہت بڑھا دیئے اور غلاموں کی جو کمی پڑ گئی تھی اسے پورا کرنے کے لئے اس نے کسانوں کو غلام بنانے کی کوشش کی ، مگر عیسائی ملت کے سرداروں کے کان پر جوں تک نہ رینگی عیسائی

مذہب تو ایک ہیرا تھا جو بدقسمتی سے سنار کے بجائے لوہار کے ہاتھ میں پہنچ گیا تھا، وہ تراشا نہیں گیا، توڑا گیا، خود بے آبرو ہوا اور اس کے ساتھ وہ لوگ بھی جو اس کے مالک تھے اور اس کی قدر پہچان نہ سکتے تھے۔

کوئی تعجب نہیں کہ عیسائی مذہب رومی سلطنت کو بچا نہ سکا، وہ اندر سے سڑتی گلتی رہی اور پھر یورپ کی وحشی نسلوں نے اسے ڈھا دیا۔ چار پانچ سو برس تک تہذیب کی پرانی کھیتیاں نئی نسلوں کے ایک سیلاب میں ڈوبی رہیں اور آخر میں پانی کا زور کچھ تھما تو سلطنت اور مذہب نے ایک دوسرے کو سہارا دے کر زمین پر پانو ٹکائے۔ اسی زمانے میں پادریوں اور گرجاؤں کا بندوبست اور مذہبی حکومت کا وہ طریقہ جس کے ایک سرے پر گاؤں کا گرجا اور پادری تھا، اور دوسرے سرے پر روم کا صدر گرجا اور صدر پادری تھا، مغربی یورپ میں قائم ہوا۔ گرجاؤں اور پادریوں کے اس سلسلے کو رومی کلیسا کہتے ہیں، اور اس کے سردار کو پاپائے روم۔

سنہ ۸۰۰ء میں جرمن نسلوں کے سردار چارلز اعظم نے یورپ کے بہت بڑے حصے پر قبضہ کر کے اپنے آپ کو شہنشاہ کہلوایا اور اپنی سلطنت کا نام مقدس رومی سلطنت رکھا۔ یہ سلطنت مقدس ہرگز نہیں تھی، اور اس کے بادشاہ اور اس کی رعایا جرمن تھی رومی نہیں تھی، لیکن یہ خیال کہ ساری عیسائی ملت کو


یورپ کے تجارتی رستے
قرون وسطےٰ میں
انگلستان
لندن
بحر اوقیانوس
پیرس
فرانس
بوردو
ہامبرگ
جرمنی
وارسا
وینا
اسپانیہ
بحر روم
بحر اسود

ایک پاپا اور ایک شہنشاہ کے نیچے رہنا چاہئے لوگوں کے دل میں بیٹھ گیا، اور کئی سو برس تک اس خیال کو اتحاد کا ذریعہ بنانے کی کوشش ہوتی رہی۔

یورپ نے بیچ کی صدیوں میں جو تھوڑی بہت ترقی کی اس میں یونان اور روم کی تہذیب یا رومی کلیسا نے ذرا بھی مدد نہیں دی۔ یونان اور روم کا اس وقت بس نام ہی باقی رہ گیا تھا، وہاں کی تہذیب کھنڈروں کے نیچے دبی پڑی تھی، اور اگر اس کا کوئی حصہ کھود کر نکالا جاتا تو اسے رومی کلیسا کا تعصب پھر زمین میں گاڑ دیتا۔ یورپی قوموں کو اس اندھیری رات میں جو روشنی ملی وہ ہسپانیہ اور سسلی کی عرب تعلیم گاہوں سے جہاں علم اور آزاد خیالی کا بڑا چرچا تھا، اور عیسائی اور مسلمان طالب علموں میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ کلیسا کے ڈر نے اس وقت یورپ والوں کو مسلمانوں کی تہذیب اور ترقی سے پورا فائدہ نہیں اٹھانے دیا، بلکہ مسلمانوں سے ایسی نفرت پیدا کی جس نے احسان ماننا درکنار، مسلمانوں سے آدمیت کا برتاؤ کرنا بھی ایک بڑا جرم بنا دیا۔ یہ بھید تو ابھی حال میں، جب رومی کلیسا اور اس کا مذہب اپنی تنگ نظری اور تعصب کی سزا بھگت چکا ہے، تھوڑے سے انصاف پسند عالموں کی کوشش سے کھلا ہے کہ مسلمانوں نے یورپ والوں کو علم کے پہلے سبق پڑھائے، صنعت کے گر سکھائے، ان کے ذہن کو اس کال کوٹھری سے نکالا جس میں کلیسا نے

لئے بند کیا تھا، اور ان کے دلوں کو جو ٹھٹھرائے جا رہے تھے نئے شوق اور نئے حوصلے کی گرمی پہنچائی۔ صلیبی جنگوں میں یورپ کے امیروں اور بادشاہوں کو پہلی مرتبہ یہ دیکھنے کا موقع ملا کہ مہذب لوگ کیسے ہوتے ہیں، کیا کھاتے، کیا پہنتے ہیں اور کس طرح سے رہتے ہیں۔ مذاق اور رہن سہن کی اس تبدیلی نے تجارتی کاروبار کو بڑھایا، صنعت کو اکسایا، ہنر کو ایڑ لگائی، اور اس طرح تہذیب کا دیا جلایا گیا۔ پھر بھی کوئی سات آٹھ سو برس تک یورپ کی تاریخ کلیسا کے لالچ اور تعصب کی داستان رہی۔ عیسائی مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی کو نجات حاصل کرنے کے لئے دنیاوی زندگی کو گناہ اور شیطان کا دھوکا سمجھ کر چھوڑ دینا چاہیئے، اور خدا سے، جو کہ سراسر رحم ہے، اور حضرت عیسیٰ سے، جو کہ محبت اور ایثار کا کامل نمونہ ہیں، لو لگانا چاہیئے۔ رومی کلیسا یہ سبق تو دہراتا رہا پر خود کبھی اس پر کاربند نہ ہوا۔ ہوس تھی حکومت کی اور اپنے ٹھاٹھ باٹ سے لوگوں کی آنکھوں میں چکا چوند ڈالنے کی۔ سترھویں صدی کے ایک انگریز مصنف نے بہت ٹھیک کہا تھا کہ رومی کلیسا قدیم رومی سلطنت کا بھوت ہی جو تاج پہنے اس کی قبر پر بیٹھا ہی۔

یورپ کی آدھی سے زیادہ زمین کلیسا کے قبضے میں تھی، اس کے

بڑے عہدہ دار سب زمیندار تھے، خود رئیسوں کی طرح رہتے تھے اور غریب آبادی سے کئی قسم کے ٹیکس وصول کرکے روم کے خزانے میں خراج کے طور پر بھیجتے تھے۔ لیکن کلیسا کی پیاس اس سے بھی نہ بجھی۔ پاپا عیسائی ملت کے سردار ہی نہیں بلکہ بادشاہوں کے بادشاہ ہونے کا دعوےٰ کرتے رہے اور اس طرح آمدنی اور اثر بڑھانے کے تمام ذریعوں پر قبضہ کرنا چاہا۔ وہ کئی سو برس تک مقدس رومی شہنشاہوں اور بیچ بیچ میں یورپ کے دوسرے بادشاہوں سے لڑتے رہے، اور اسی لڑائی کا شاخسانہ یہ تھا کہ پاپاؤں نے صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع کیا۔ ان لڑائیوں میں لاکھوں آدمی مارے گئے، سینکڑوں بستیاں اجڑ گئیں، مگر پاپاؤں کو اس کی پروا نہ تھی۔ وہ تو اس پر خوش تھے کہ ان کی آمدنی بڑھی، ان کا اثر بڑھا، اور وہ بادشاہ جو ایسا نہیں کرنے پر تیار رہتے تھے ایک مشکل میں پھنسا دئے گئے۔ پہلے تو صلیبی جنگوں کی بڑی دھوم مچی، پھر پاپاؤں کا بھانڈا پھوٹ گیا، اور کوئی ان کے کہنے سے صلیب کے لئے لڑنے پر تیار نہ ہوتا تھا۔ کلیسا کی جو حیثیت تھی اس پر بھی بادشاہوں سے ٹکر لینا آسان کام نہ تھا، پاپاؤں کا خرچ اتنا بڑھ گیا تھا کہ انھیں آمدنی بڑھانے کی نت نئی تدبیریں سوچنا پڑیں۔ انھیں میں سے ایک تدبیر یہ تھی وہ گناہوں کے معافی نامے بیچتے تھے اور اسی نے یورپ کی مذہبیت کو ایسا صدمہ پہنچایا کہ

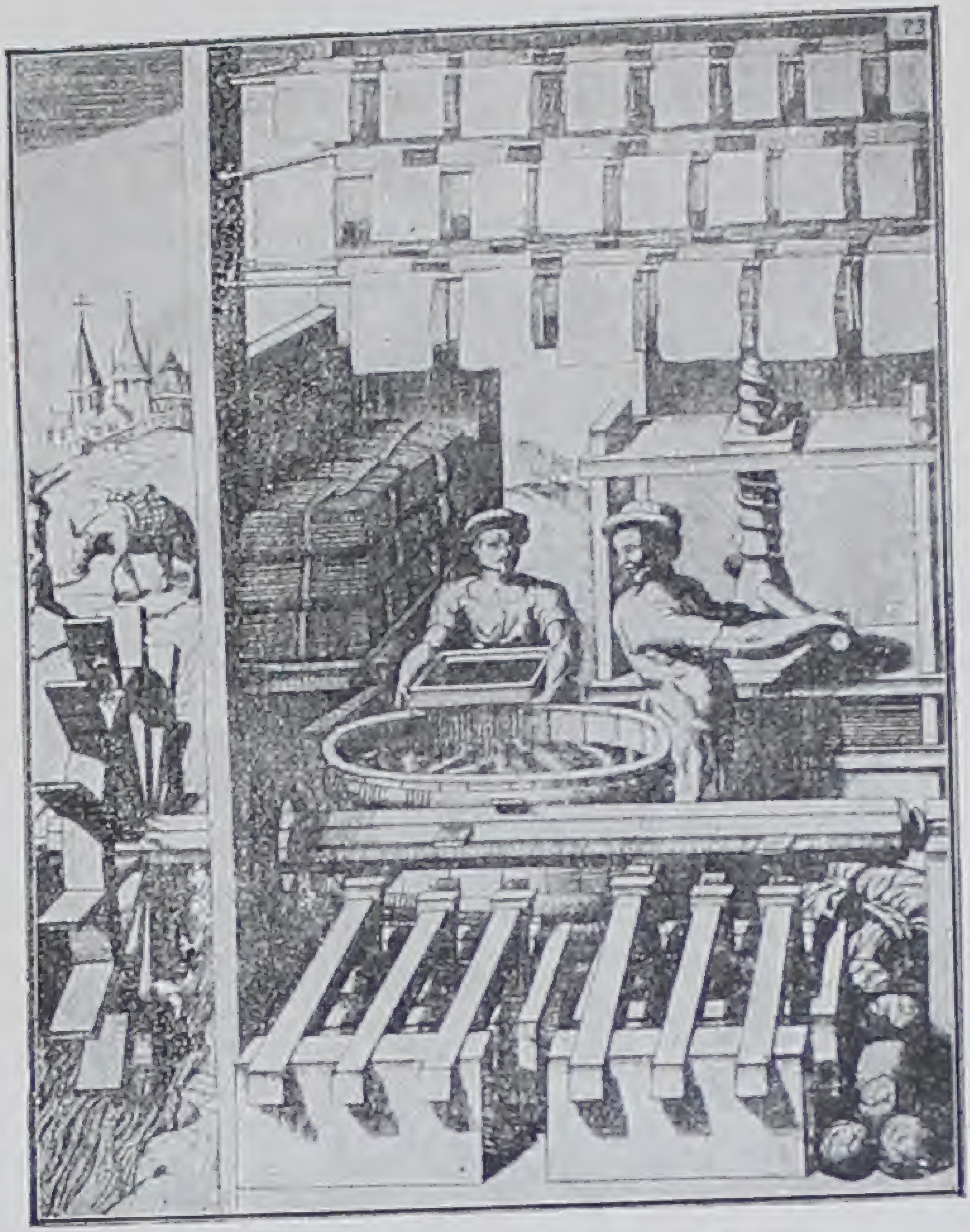
وہ پاپا اور کلیسا سے لڑنے کے لئے تلوار کھینچ کر میدان میں کود پڑی۔

عیسائی فرقوں کو ایک دوسرے سے جو دشمنی تھی اس کا میں ذکر کر چکا ہوں مغربی یورپ میں رومی کلیسا کا جب سکہ پڑا تو سمجھئے نفرت اور تعصب کا مادہ بھی ایک جگہ جمع ہو گیا۔ اس کا مزہ مسلمانوں ہی نے نہیں بلکہ خود یورپ والوں نے بھی خوب چکھا، کہ ان میں جو شخص یا جماعت کسی طرح سے بھی رومی کلیسا کی ذرا بھی مخالفت کرتی یعنی کلیسا کے عہدہ داروں کی ہر بات آنکھ بند کر کے نہ مانتی اسے کلیسا دوزخ کی آگ سے بچانے کے لئے خود جلا دیتا تھا۔ اس طرح جنوبی فرانس میں علاقے کے علاقے اس وجہ سے پھونک دئے گئے کہ ان میں ایسے فرقے کے لوگ آباد تھے جو رومی کلیسا کے عقیدے سے ذرا اختلاف کرتے تھے، اور عیسائیوں میں ان معصوم بچوں پر بھی کوئی ترس کھانے والا نہ نکلا جو اپنے ماں باپ کے ساتھ جلتے ہوئے گھروں میں پھینک دئے گئے۔

کلیسا کے تعصب کی آگ ایسی تھی کہ اگر کبھی وہ بجھنے لگتی تو فوراً اس کے لئے نیا ایندھن تلاش کیا جاتا، کہ دین کی روشنی اس سے پھیلتی تھی اور کلیسا کے بدن میں گرمی بھی پہنچاتی تھی۔ افسوس کی بات ہے کہ رومی کلیسا کی مخالفت میں جو نئے فرقے بنے اور کامیاب ہوئے انھوں نے بھی گمراہوں کو جلانے



قرونِ وسطیٰ میں یورپ کی دیہاتی زندگی



قرون وسطیٰ میں کاغذ سازی

کی رسم جاری رکھی اور تعصب کے شعلے دبنے کے بجائے بھڑک اٹھے۔

رومی کلیسا نے اپنے تعصب کے سبب سے تو کوئی نقصان نہیں اٹھایا، لیکن پاپاؤں اور شہنشاہوں کی لڑائیوں کا انجام یہ ہوا کہ دونوں گھائل ہو گر گری یہ خیال کہ ساری عیسائی سماج کا ایک سردار ہونا چاہیئے دلوں سے مٹ گیا۔ لوگ اس پر راضی ہو گئے کہ الگ الگ سلطنتیں قائم ہوں، اور سلطنتوں کے بادشاہ کسی کے ماتحت نہ ہوں۔ یہ ایک بہت بڑا انقلاب تھا جس نے یورپ کی زندگی کا نقشہ بدل دیا، کہ انھیں بادشاہوں کی بدولت رومی کلیسا نے منہ کی کھائی، حکومت کی نئی تدبیریں اور ترکیبیں سوچی گئیں، اور تجارت اور صنعت پرانے بندھنوں سے چھوٹی۔ یورپ میں جب نئی نسلیں آباد ہوئیں تو حکومت کا ایک طریقہ نکلا جس میں کسان سے لے کر بادشاہ تک ہر شخص کا کسی دوسرے سے ایک طرح کا معاہدہ تھا، اور ہر شخص کے حقوق اور اس کے فرائض مقرر تھے۔ کسان کا فرض تھا کہ کھیتی کرے، زمیندار کا حق تھا کہ پیداوار میں سے کسان کے لئے ایک حصہ چھوڑ کر باقی سب لے لے، مگر کسان کی جان و مال کی حفاظت کرے۔ چھوٹے زمینداروں کے اوپر بڑے زمیندار تھے، جنھیں وہ لگان بھی دیتے تھے، اور اس وعدے پر کہ ضرورت کے وقت ان کی مدد کی جائے گی، وہ خود اس کے ذمہ دار ٹھہرائے جاتے تھے کہ جب

بلائے جائیں تو سپاہیوں کی ایک خاص تعداد دے کر سرپرست کے پاس پہنچ جائیں یہ سلسلہ جا کر بادشاہ بلکہ شہنشاہ پر ختم ہوتا تھا جس کی فرماں برداری سب پر فرض تھی، اور سب کی خبرگیری اس پر۔ اس نظام میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ سارا بوجھ کسانوں پر لادا گیا تھا، جو حقیقت میں غلاموں سے بھی بدتر حال میں تھے، اور سب سے زیادہ الجھن بادشاہ کو رہتی تھی کہ اگر بڑے سردار اس سے بگڑ جاتے تو اس کے پاس نہ سرمایہ رہ جاتا اور نہ فوج۔ دوسری بات دیکھنے کی یہ ہے کہ تاجر، کاریگر، دستکار اور مزدور کی اس نظام میں کوئی کھپت نہیں۔ یہ لوگ ہمیں شروع میں بس تھوڑے سے شہروں میں ملتے ہیں، ان کی نہ کوئی حیثیت تھی اور نہ ان کا کوئی پوچھنے والا۔ لیکن آہستہ آہستہ پہلے اطالیہ میں، جو اسلامی دنیا کے بہت قریب تھا، اور پھر شمالی یورپ میں بھی شہروں میں تجارت اور صنعت بڑھی، تاجر مالدار ہوتے گئے اور بادشاہوں نے ان سے سمجھوتا کر کے بڑے زمینداروں کو دبایا، معاہدے کی ان زنجیروں کو توڑا جن میں ساری آبادی جکڑی ہوئی تھی اور اپنے اور اپنی رعایا کے درمیان کوئی بیچ کی کڑی نہیں رکھی۔ بادشاہوں کو فکر اس کی تھی کہ ان کی اپنی طاقت بڑھے اور ان کا بول بالا ہو۔ مگر اپنی غرض پوری کرنے کے لئے انھوں نے جو چالیں چلیں ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کی قومیں بھی ایک ایک

کرکے گہری نیند سے اٹھیں اور انھوں نے انگڑائیاں لے کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو ہمت اور حوصلہ کے لئے ایک بڑا بھاری میدان پڑا پایا۔

یورپی قوموں نے شاید بہت جلد ترقی کی ہوتی اگر کلیسا نے انھیں قابو میں رکھنے کے لئے تعصب اور تنگ نظری کی جو دوا پلائی تھی اس کا ان پر بیدار اور ہوشیار ہونے کے بعد بھی اثر نہ رہتا۔ مسلمانوں کی صنعتوں کی نقل کرتے کرتے یورپ والوں کے ہاتھ میں خاصی صفائی آگئی تھی اور اطالیہ کے تاجروں نے عربوں سے بڑا کاروبار کرنے کا ڈھنگ بھی سیکھ لیا تھا۔ پھر ایک وقت آیا جب مشرق اور مغرب کے تاجروں میں مقابلہ ہو گیا، مغرب والے محسوس کرنے لگے کہ جب تک مشرق کی منڈیوں اور تجارتی رستوں پر عربوں اور ترکوں کا قبضہ ہے وہ آگے نہ بڑھ سکیں گے، اور انھوں نے ایشیا تک پہنچنے کے نئے رستے ڈھونڈھنے شروع کئے اسی کوشش میں کولمبس نے امریکہ دریافت کیا اور واسکوڈگاما ہندوستان آیا۔ ادھر تیرھویں صدی میں تاتاروں نے مشرقی صنعت پر ایسا دوہتھڑ مارا کہ وہ پھر پنپ نہ سکی اور آہستہ آہستہ یورپ والے، جو پہلے مشرق کی بنی ہوئی چیزیں اپنے یہاں منگواتے تھے، اپنی تمام ضروریات خود پوری کرنے لگے۔ تجارت کے ساتھ ان کی تہذیب نے بھی آگے قدم بڑھایا، مگر گرتے پڑتے ان میں آزادی کا حوصلہ سب سے

پہلے اس طرح ظاہر ہوا کہ رومی کلیسا سے بغاوت کی گئی مگر باغی ایک دوسرے سے وہی تعصب برتتے رہے جو رومی کلیسا کا سمجھئے دھرم تھا۔ مذہبی اختلاف کی سزا میں لوگ آگ میں جھونکے جاتے رہے، اور ہر ملک کو مذہب کی وجہ سے خانہ جنگی کی مصیبتیں جھیلنا پڑیں۔ امریکہ اور ہندوستان کا رستہ پندرھویں صدی کے آخر میں دریافت ہوا، اور یورپ کی آخری مذہبی جنگ ۱۶۴۸ء میں ختم ہوئی۔ نئے فرقوں کا مذہب دنیا کا دشمن نہیں تھا، پھر بھی ہر ملک میں سچی تہذیب اور ترقی کے شوق کا سر کچلا جاتا رہا۔ یورپ میں علم کا دیا مذہب کے چراغ کو بجھا کر جلایا گیا اور اب بھی لوگ سمجھتے ہیں کہ ان دونوں کا ایک ساتھ جلنا قدرتی قانون کے خلاف ہے۔

(۱۵)

جدید یورپ کی سیاست

پندرھویں صدی کے آخر تک یورپ کے رہنے والے مہذب زندگی کی پہلی منزلیں طے کر چکے تھے، ملک اور زبان اور معاشرت کے اعتبار سے کئی حصوں میں تقسیم ہو چکے تھے، ان کے بادشاہوں نے ان پابندیوں کو بہت کچھ توڑ دیا تھا جن میں جرمن شہنشاہی کے قائم کیے ہوئے جاگیری نظام نے ان کو جکڑ دیا تھا، اور اٹلی میں علم، ادب، آرٹ اور تہذیب کا ایک ذوق پیدا ہو گیا تھا جس نے پرانے مذہب کو جڑ سے ہلا دیا۔ نئی زندگی کے آثار ہیں ہر جگہ ایک وقت میں نظر نہیں آتے، شاہی حکومت سب سے پہلے انگلستان اور فرانس میں اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی، نئے مذہبی خیالات کی کرن سب

سے پہلے جرمنی میں پھوٹی، نئی تہذیب کے پہلے پھول اٹلی میں کھلے، امریکہ کا رستہ یہیں کے ملاحوں نے دریافت کیا اور پرتگالی سب سے پہلے افریقہ کا چکر لگا کر ہندوستان پہنچے۔ اس نئے زمانے کی تہذیب کا ذکر پھر ہوگا ابھی ان سیاسی تحریکوں اور انقلابوں کا حال سن لیجئے جنھوں نے یورپ اور یورپ کے ساتھ پوری دنیا کا نقشہ بدل دیا۔

سیاست دنیا میں کوئی نئی چیز نہیں، اور جب تک یورپ کی سیاست بادشاہوں کے ہاتھ میں رہی اس میں کوئی بات انوکھی یا نرالی نہ تھی لیکن آہستہ آہستہ وہ شکایتیں اور عداوتیں جو بادشاہوں نے اپنی رعایا کو دوسروں سے لڑا کر پیدا کی تھیں تاریخ بنیں، اور اس تاریخ میں ایسے عنصر شامل ہو گئے جنھوں نے قومی داستانوں کو قومیت کا دھرم بنا دیا۔ جیسے جیسے یہ دھرم پھیلا، ویسے ہی سیاسی تنظیم کے نئے اصول دریافت کئے گئے جنھوں نے سماج کو آٹے کی طرح گوندھا، حکومت کی نئی تدبیروں اور ترکیبوں سے اس میں لس پیدا کی گئی، اور آزادی کی گرمی دے کر اس کا خمیر اٹھایا گیا، قومیت کے دھرم نے ہمتوں کو اس طرح بڑھایا کہ یورپ والے دنیا پر چھا گئے، اور سیاست اور تجارت کے جال کو اس طرح پھیلایا کہ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی جماعت اور دنیا کی ہر بستی اس کے پھندے میں آگئی۔ جدید یورپ کی سیاسی تاریخ کا جوہر یہی قومیت کا دھرم ہے اور اس وقت

سیاست کی دنیا اسی آفتاب کے گرد چکر لگا رہی ہے۔

ہم یورپ والوں کی دیکھا دیکھی اسے ایک قدرتی بات سمجھنے لگے ہیں کہ ہر ملک کے رہنے والے اپنے آپ کو ایک قوم مانیں اور قوم کی بھلائی کے لئے سب کچھ قربان کرنے پر تیار رہیں۔ لیکن یورپ میں جو قومیں بنیں وہ آپ ہی آپ نہیں بنیں۔ بادشاہ ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے رہے ہیں، مذہب، رواج، طبیعت اور مذاق کا فرق ہمیشہ دنیا کی آبادی کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کرتا رہا ہے۔ قومیت کا دھرم اس اختلاف سے ایک بالکل جدا چیز ہے، انسانی طبیعت کی یہ ایک ایجاد ہے جس کی مثال ہمیں کسی اور دیس، کسی اور زمانے میں نہیں ملتی۔ سماج کا قوم بننا قدرتی بات ہے نہ لازمی، یورپ نے یہ نیا دھرم اختیار کیا تو اس کی خاص وجہ تھی، ارادے اور مجبوری کا ایک خاص سانچہ تھا جس میں یورپ کی زندگی اور یورپ والوں کی ذہنیت ڈھائی گئی، تب کہیں جاکر وہ اس مذہب کو قبول کر سکی۔ سانچہ تیار کرنے میں کچھ تو جغرافیہ اور تاریخ کا ہاتھ تھا، کچھ مذہب کا کچھ ان لوگوں کا جو متوسط طبقے میں شمار کئے جاتے ہیں، اور جن کی تعداد کہیں اور کبھی اتنی نہیں ہوئی جتنی کہ یورپ میں۔

روس کے سوا یورپ کے تمام ملک نہ اتنے بڑے ہیں کہ ان کی آبادی میں ایک معاشرت، ایک طبیعت اور ہم آہنگ اغراض رکھنے کا احساس پیدا

نہ ہو سکے، اور نہ اتنے چھوٹے کہ ان کے لئے اپنی حفاظت کرنا بس کی بات نہ ہو۔ ان تمام ملکوں میں ایک ہی نسل کے لوگ آباد نہیں ہیں کہیں کہیں مذہب و زبان کا بھی اختلاف ہے، اور بعض حصے ایسے ہیں جن کے بارے میں یہ اب تک طے نہیں ہو سکا ہے کہ انھیں کس ملک اور کس قوم میں شامل ہونا چاہیئے لیکن یورپ کے اکثر ملکوں کے بہت بڑے حصے کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ پہاڑوں یا دریاؤں نے اسے اور ملکوں سے الگ کر دیا ہے اور اس کے باشندے نسل اور مذہب، زبان یا اور کسی سبب سے اپنے آپ کو دوسروں سے جدا سمجھیں تو غلط نہ ہوگا۔ اپنے پرائے، دیسی پردیسی کے اس فرق کو عداوتوں اور لڑائیوں نے اور بڑھا دیا ہے، مگر یہ ساری باتیں قومیت کا وہ جوش پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں جسے ہم آج کل یورپ میں موجیں مارتے دیکھ رہے ہیں۔ قدرت نے قومیت کو تھوڑا سا سہارا تو دیا، پر اس میں جان کسی اور طرح سے پڑی۔ بادشاہوں کی چالیں، ان کے لڑائی جھگڑے ملکوں کی حدیں بڑھاتے گھٹاتے اور ایک دوسرے کی قوت کو آزماتے رہے لیکن اپنی غرض کو اصول بنا دینا، فوج اور قوم کو ایک چیز کے نام کر دینا بادشاہوں کے بس کی بھی بات نہ تھی۔ قدرت کی طرح بادشاہوں کی سیاست نے بھی بس قومیت کو سہارا ہی دیا۔

اب مذہب کو دیکھئے کہ اس نے کیا کیا۔ یورپ کے لوگوں کو جب ذرا سوجھ بوجھ آئی، علم کی روشنی ذرا پھیلی اور انھوں نے اپنے پرانے مذہبی رہنماؤں کی تعلیم اور زندگی کو جانچنا پرکھنا شروع کیا تو اسے بہت گرا ہوا پایا، اور کئی ایسے لوگ تھے جنھوں نے اپنی جان پر کھیل کر پرانے مذہب کو سدھارنے کی کوشش کی۔ سولھویں صدی میں جرمنی میں لوتر اور فرانس میں کیلون دو ایسے مصلح پیدا ہوئے جن کی تعلیم کا بہت چرچا ہوا اور ہزاروں لاکھوں آدمی پرانے مذہب کو چھوڑ کر ان کے پیرو ہو گئے۔ نئے اور پرانے خیالات میں بنیادی اختلاف تھا، اور چونکہ دونوں کا یہ اصول تھا کہ غلط عقیدے کو جڑ سے اکھاڑ دینا، یعنی اس کے ماننے والوں کو قتل کر دینا چاہیئے، اس لئے لڑائی کا بھی سامان ہو گیا۔ جرمنی کے کئی بادشاہوں نے لوتر کی سرپرستی کی، کیلون نے شہر جے نی وا کو اپنا مرکز بنایا، وہاں ایک طرح کی مذہبی حکومت قائم کی جو نمونے کا کام دیتی تھی اور جنوبی فرانس، ہالینڈ اور اسکاٹ لینڈ کی قریب قریب پوری آبادی نے اس کے عقیدے اختیار کر لئے۔ انگلستان میں بھی لوتر اور کیلون کی تعلیم کا خاصہ اثر تھا، اگرچہ عام طور سے لوگ پوری طرح اس کے یا اس کے پیرو نہیں ہوئے۔ اگر اس زمانے میں جب کہ نئے مذہبی خیالات پھیلے لوگوں میں اتنا تعصب نہ ہوتا کہ وہ مذہبی اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے

کے خون کے پیاسے ہوجائیں، یا ان کو قوم کی سلامتی اور آبرو کی اتنی فکر ہوتی کہ مذہب کی خاطر وہ اسے گنوانے پر تیار نہ ہوں، تو شاید ہم اس وقت قومیت کے جذبے کو اتنا قوی نہ پاتے۔ لیکن ہوا یہ کہ پہلے فرانس اور پھر جرمنی اور انگلستان میں مذہبی عداوتوں نے ہر طرح کے فتنے فساد کو بڑھنے کا موقع دیا، اور آپس کی لڑائیوں میں جو خونریزی اور بربادی ہوئی اس کے علاوہ ہم مذہب پردیسیوں سے بھی مدد مانگی گئی، اور اس طرح آزادی اور خودداری بھی خطرے میں پڑ گئی۔ لڑائی کا نتیجہ عام طور سے یہ ہوا کہ ایک فرقے کو فتح ہوئی اور اس نے اپنے مذہب کو سرکاری مذہب بنا کر چھوڑا۔ اس طرح ہر سلطنت ایک ریاست ہوگئی جس میں مذہبی جماعت کی بھی شان تھی، اور چونکہ اسے دیسی اور پردیسی دشمنوں سے بچانے کے لئے خون بہایا گیا تھا، وہ دیس والوں کو پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ عزیز ہوگئی۔ مذہبی جنگوں کے زمانے میں اور اس کے پچاس ساٹھ برس بعد تک ریاست اور حکومت کے جس طرح سے گن گائے جاتے ہیں اس سے ہمیں اندازہ ہوجاتا ہے کہ مذہب نے فساد کرکے بھی ریاست اور قومیت کو کتنا ابھارا۔ دوسری طرف مذہب نے رعایا میں مخالفت کا مادہ پیدا کرکے سیاسی آزادی کی بھی بنیاد رکھی۔ وہ مذہبی جنگوں ہی کا زمانہ تھا جب ہولینڈ والوں نے ہسپانیہ سے لڑکر اپنی آزادی حاصل

کی، اور دوسرے ملکوں میں تو نہیں مگر انگلستان میں مذہبی اختلاف ہی کی بدولت قانون کی ایسی تشریحیں اور ترمیمیں ہوئیں کہ جن سے شہریوں کے حقوق اور ان کی آزادی محفوظ کر دی گئی۔ ہاں اور اگر بعد کو لوگ مذہبی جنگوں کو یاد کر کے خیالات کی آزادی کو ضروری ٹھیرانے لگے اور تعصب کے ساتھ مذہب کے ساتھ بھی پیچھے پڑ گئے تو بھی قومیت کو ایک طرح سے ابھار اگیا، کیونکہ مذہب بحث سے خارج کر دیا گیا تو قومیت کے سوا سیاسی اتحاد اور یک جہتی بلکہ یوں کہئے زندگی کی صورت قائم رکھنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں رہا۔

سولھویں صدی میں جو نئے عقیدے رائج ہوئے اُنھوں نے دین اور دنیا کی عداوت کو مٹا دیا جو پُرانے مذہب کی جان تھی اور ملازمت کاروبار یا پیشے میں کامیابی حاصل کرنے کو ایک اچھا اور سچا حوصلہ قرار دیا۔ یہ ایک بہت بڑا انقلاب تھا، اور یہ ہوا اس سبب سے کہ اب یورپ میں ان لوگوں کے درمیان جو دنیا سے منہ پھیرنے پر مجبور تھے کہ دنیا انھیں کچھ دیتی نہ تھی اور ان کے جن کا پیٹ اتنا بھرا تھا کہ وہ بھوک کو جانتے ہی نہ تھے کہ کیا بلا ہے ایک خاصا بڑا طبقہ ایسے لوگوں کا پیدا ہو گیا تھا جن کے لئے دولت کمانے یا حیثیت پیدا کرنے کا امکان تھا اور جنھیں اس کی ضرورت تھی کہ ان کی ہمت بڑھائی جائے اور ان کی محنت کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا جائے۔ نئے مذہبوں نے ان کی

آرزو پوری کی اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ملک میں نئے مذہب کو اسی متوسط یا بیچ کے طبقے نے اختیار کیا، حق اور آزادی کے لئے سب سے پہلے اسی نے تلوار کھینچی اور جنگوں کے بعد حکومت اور کاروبار کو بھی اسی نے سنبھالا جن ملکوں میں یہ طبقہ کمزور تھا، جیسے ہسپانیہ یا اٹلی، وہاں نئے مذہب کا ذرا بھی چرچا نہ ہوا، اور ان ملکوں نے سیاست اور تجارت میں ترقی بھی نہیں کی۔ جہاں یہ طبقہ طاقت ور تھا، جیسے انگلستان اور ہولینڈ میں، وہاں پُرانا مذہب مٹ گیا، نئے مذہب کے پیدا کئے ہوئے حوصلے روپیہ برسانے لگے، اور آزادی نے قانون بنائے اور امن اور شانتی کی سرپرست اور نگہبان بن گئی۔

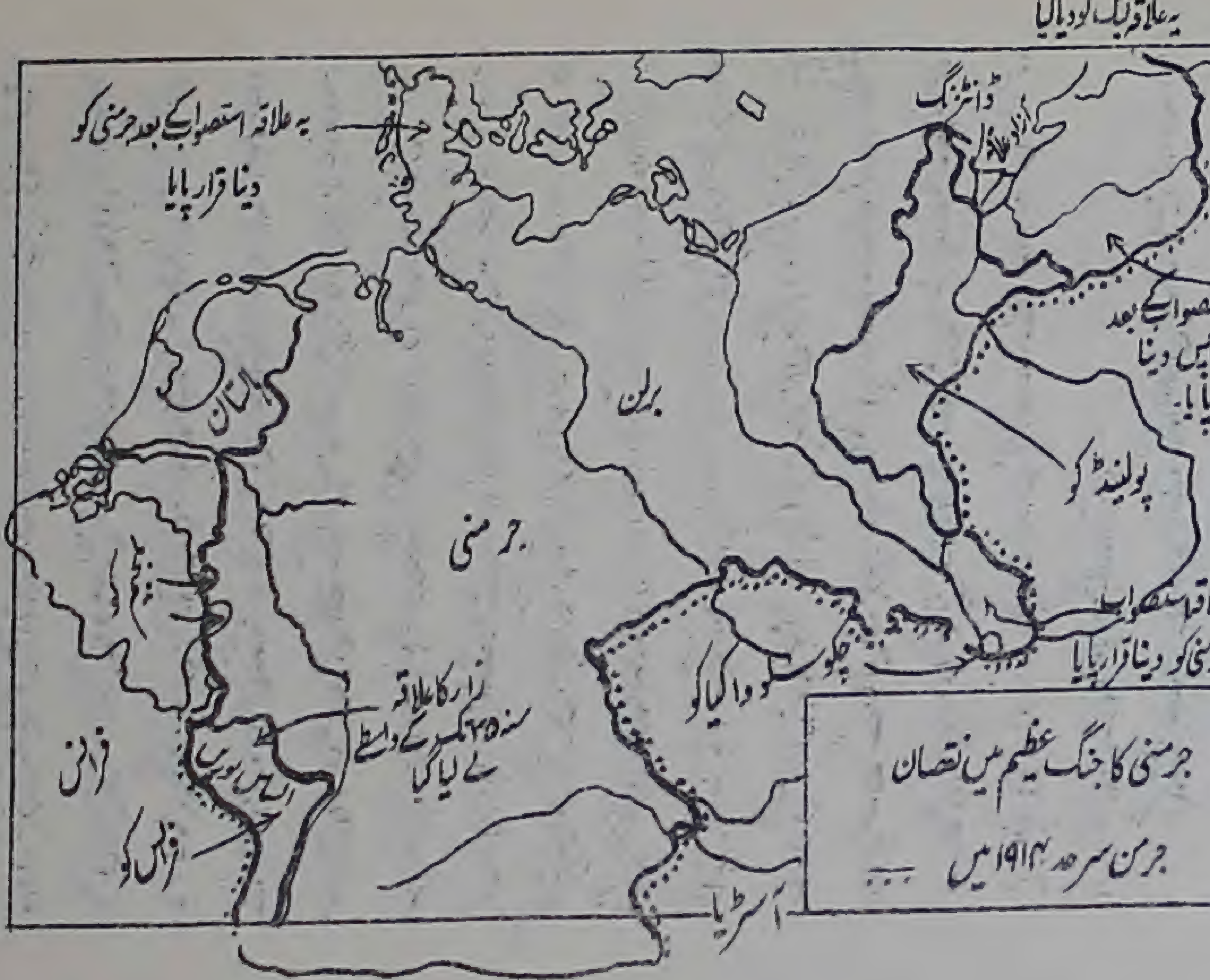
فرانس ایک ایسا ملک تھا جہاں متوسط طبقہ کمزور نہیں تھا، اور جہاں نئے مذہب نے صنعت اور تجارت کو بہت فروغ دیا۔ لیکن ایک طرف کسان اور دوسری طرف حکومت پُرانے مذہب پر اڑی رہی اور مذہبی جنگوں کو ختم ہوئے پچاس ساٹھ برس ہو چکے تھے جب ایک بادشاہ کے تعصب نے نئے مذہبی فرقے اور اس کی پیدا کی ہوئی خوش حالی کو نیست و نابود کر دیا، اور غیر ذمہ دارانہ حکومت کی ایک طرح ڈالی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سو برس کے اندر حکومت دیوالیہ ہو گئی اور متوسط طبقے کے لوگ، جو ہر سیاسی اور سماجی حق سے

محروم رکھے گئے تھے، شاہی حکومت کے جانی دشمن ہو گئے۔ چونکہ انھیں حکومت میں کسی طرح سے شریک ہونے کا موقع نہیں دیا گیا تھا تعلیم یافتہ فرانسیسیوں کے دماغ میں اصول ہی اصول بھر گئے اور یہی وجہ تھی کہ فرانسیسی انقلاب میں خون بہت بہا، حکومت کا شیرازہ بکھر گیا، اور وہی لوگ جنھوں نے ایک بادشاہ کا سر صرف اس جرم میں کاٹا تھا کہ وہ اپنے باپ کا بیٹا تھا یہ دیکھ کر کہ اور کسی طرح کام نہیں چلتا نپولین کی شخصی حکومت پر راضی ہو گئے اور اسے بادشاہ ہی نہیں، شہنشاہ بنا دیا۔ لیکن فرانسیسی انقلابیوں کی اصول کی بحثیں اور اُدھیڑ بُن بے کار نہیں گئی۔ نپولین کی فوجوں نے ہسپانیہ سے روس تک ہر پُرانی شاہی حکومت اور اس کے انتظام کو ایسی ٹھوکر ماری تھی کہ وہ بغیر پہلو بدلے سنبھل نہیں سکتا تھا، اور جب یورپ کی تمام قومیں نپولین کے خلاف میدان میں آگئیں اور اس کی سیاست اور فرعونیت کو خاک میں ملا دیا تو وہ بھی فرانسیسی انقلابیوں کی طرح حق اور آزادی کی قسمیں کھانے لگے، اور یورپ میں جمہوری حکومت عام معیار بن گئی۔

لیکن ان نئی حکومتوں نے اپنا نام چاہے جو کچھ رکھا ہو، دراصل وہ تھیں سرمایہ داروں اور متوسط طبقے کے ہوشیار لوگوں کی حکومتیں جنھیں صنعتی انقلاب نے، جو اٹھارھویں صدی کے وسط سے آہستہ آہستہ شروع ہوا اور

کوئی سو برس میں تکمیل کو پہنچا، قومی زندگی پر اور بھی حاوی کر دیا تھا۔ صنعت اور تجارت کو بڑھانے، اپنی جیب اور اپنی مشینوں کا پیٹ بھرنے کے لئے سرمایہ داروں نے قومیت کو اپنا دھرم بنایا، دنیا کی منڈیوں پر خود پیش قدمی کر کے یا سیاست اور فوج کے بل پر قبضہ کیا، اور جب قبضہ ہو گیا تو تہذیبی خدمت اور اخلاق اور جمہوریت کی آڑ لے کر اسے قائم رکھا۔ مگر ہوس اور صنعتی نظام کی مجبوریوں نے بہت جلد یورپی قوموں کے لئے دنیا تنگ کر دی، اور ۱۹۱۴ء میں ان کے درمیان وہ تصادم ہوا جو جنگ عظیم کے نام سے مشہور ہے، اور جو سرمایہ داری اور ملوکیت کے زوال کا پہلا قدم ہے۔

صنعت اور تجارت کا جو مقابلہ ۱۸۵۰ء کے بعد سے شروع ہوا اس میں انگلستان سب سے آگے بڑھا ہوا تھا۔ یہ ملک جزیرہ ہونے کے سبب سے بہت محفوظ تھا اور اس وجہ سے انگریزوں کو دنیا بھر میں گھومنے اور جگہ جگہ اپنا جھنڈا گاڑ کر حکومت کرنے کا بہت اچھا موقع ملا۔ ہندوستان میں اتنا بڑا ملک ان کے ہاتھ آیا، اور اپنی صنعت کو پہلے سبق سکھانے کے لئے ایسے اچھے نمونے ملے کہ ان کی صنعت نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی، اور جب دوسری قوموں کو خام مال اور منڈیوں کی ضرورت ہوئی تو انھوں نے ہر جگہ انگریزوں کو اپنے رستے میں حائل دیکھا۔ جرمن قوم اپنی استعداد کو محسوس کرتی

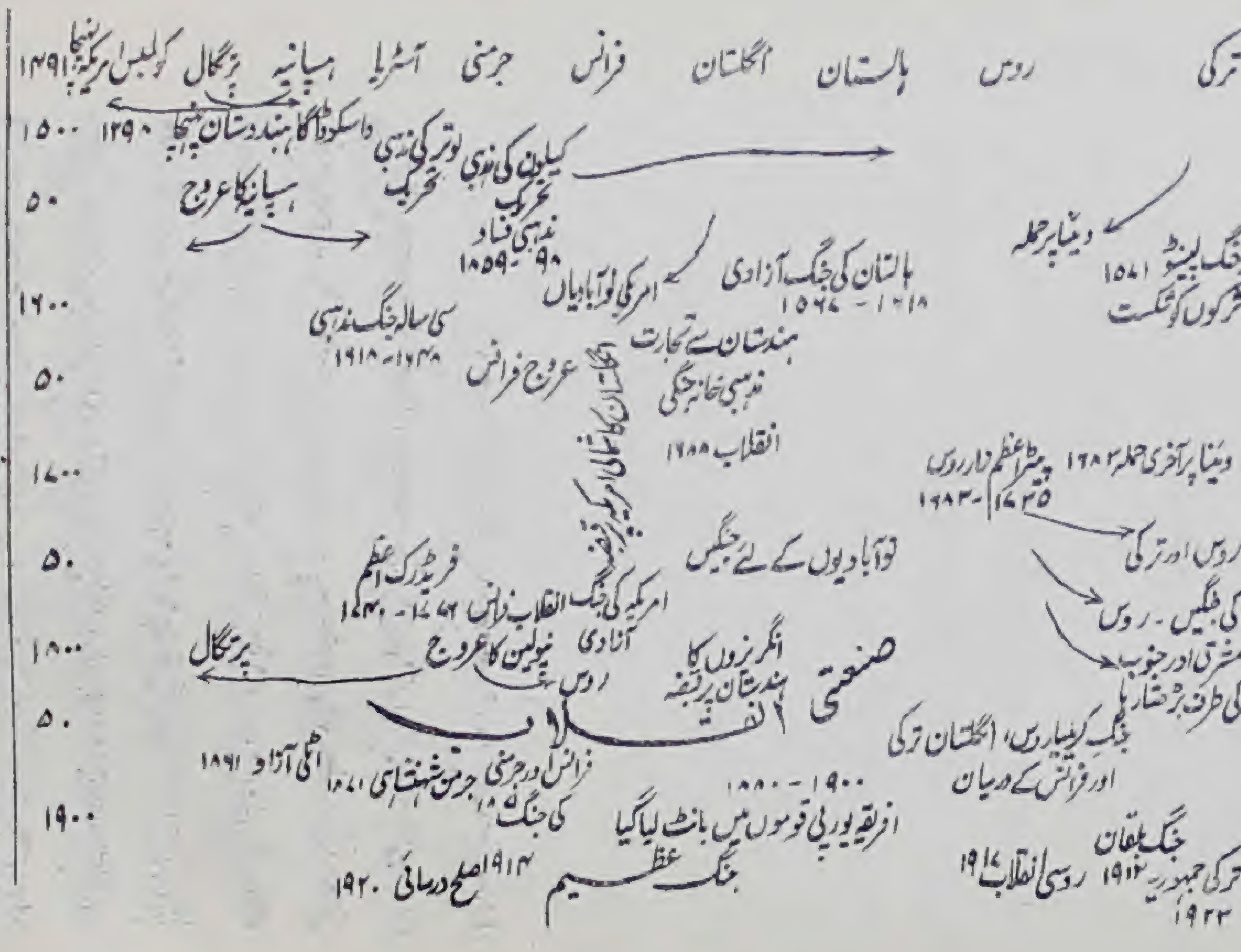

یہ علاقہ لیگ کو دیا گیا
یہ علاقہ استصواب کے بعد جرمنی کو دینا قرار پایا
ڈانٹزگ
یہ علاقہ استصواب کے بعد جرمنی کو واپس دینا قرار پایا
برلن
پولینڈ کو
جرمنی
ہالینڈ
بلجیم
یہ علاقہ استصواب کے بعد جرمنی کو دینا قرار پایا
چیکوسلواکیا کو
زار کا علاقہ سنہ ۳۵ء تک کے واسطے لے لیا گیا
فرانس
الساس لورین
فرانس کو
آسٹریا
جرمنی کا جنگ عظیم میں نقصان
جرمن سرحد ۱۹۱۴ء میں

تھی اور ترقی کرنا اپنا حق سمجھتی تھی، اس لئے وہ رفتہ رفتہ مقابلے پر آئی اور اس کی سیاسی رہبری دور اندیش اور موقع شناس لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی تو غالباً وہ سیاست میں انگریزوں کو اسی طرح نیچا دکھاتی جیسے کہ صنعت میں۔ لیکن بدقسمتی سے قیصر ولیم اور اس کے مشیر باتیں ایسی کرتے تھے کہ سب ان کے خلاف ہو جائیں اور چالیں ایسی چلتے تھے کہ ان کے مخالفوں میں اتحاد پیدا ہو جائے۔ یہ سراسر جرمن سیاست کا قصور ہے کہ انگلستان اور فرانس کے درمیان ۱۸۹۵ء میں اتحاد ہوا اور ۱۹۰۵ء میں روس بھی اس اتحاد میں شریک ہو گیا، ورنہ انگریزی اور فرانسیسی مدبروں کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں، اور ان کی فروگذاشتوں سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ جرمنی نے اندھا بن کر لنگڑے آسٹریا کو اپنے کندھوں پر نہ لادا ہوتا، اور اپنی عقل کو آسٹریا کے موروثی معموں میں الجھا نہ دیا ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ وہ انگریزی تجارت اور سیاست کے جال کو، جو یورپ کے مغربی سرے سے ایشیا کے مشرقی سرے تک پھیلا ہوا تھا بیچ سے کاٹ دے لیکن آسٹریا نے اسے بلقان میں پھنسا دیا، اور اس پھندے سے چھٹنے کے لئے اسے روس، فرانس اور انگلستان سے اعلان جنگ کرنا پڑا۔

جنگ عظیم سے نہ سیاست کے اصول بدلے نہ معیشت کے، اور

ہولناک خونریزیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان اور فرانس کو یورپ کا نقشہ اپنی مرضی کے مطابق بدلنے کا موقع مل گیا لیکن دنیا کی نجات اس میں ہرگز نہیں ہے کہ انگلستان اور فرانس کا اختیار بڑھے اور دوسروں کا کم ہو، اور یورپ کی سیاسی گتھیوں کا یہ حل بھی نہیں۔ ابھی جنگ عظیم کو بیس برس نہیں ہوئے ہیں اور پھر ویسے ہی طوفان کے آثار ہر طرف نظر آ رہے ہیں۔ یہ طوفان غالباً یورپ میں کسی قوم کو اس لائق نہ چھوڑے گا کہ اپنی بھلائی کے لئے بھی کچھ کر سکے اور ہر طرف کھنڈروں سے خاک اُٹھتی دکھائی دے گی۔

تاریخ یورپ کا نقشہ



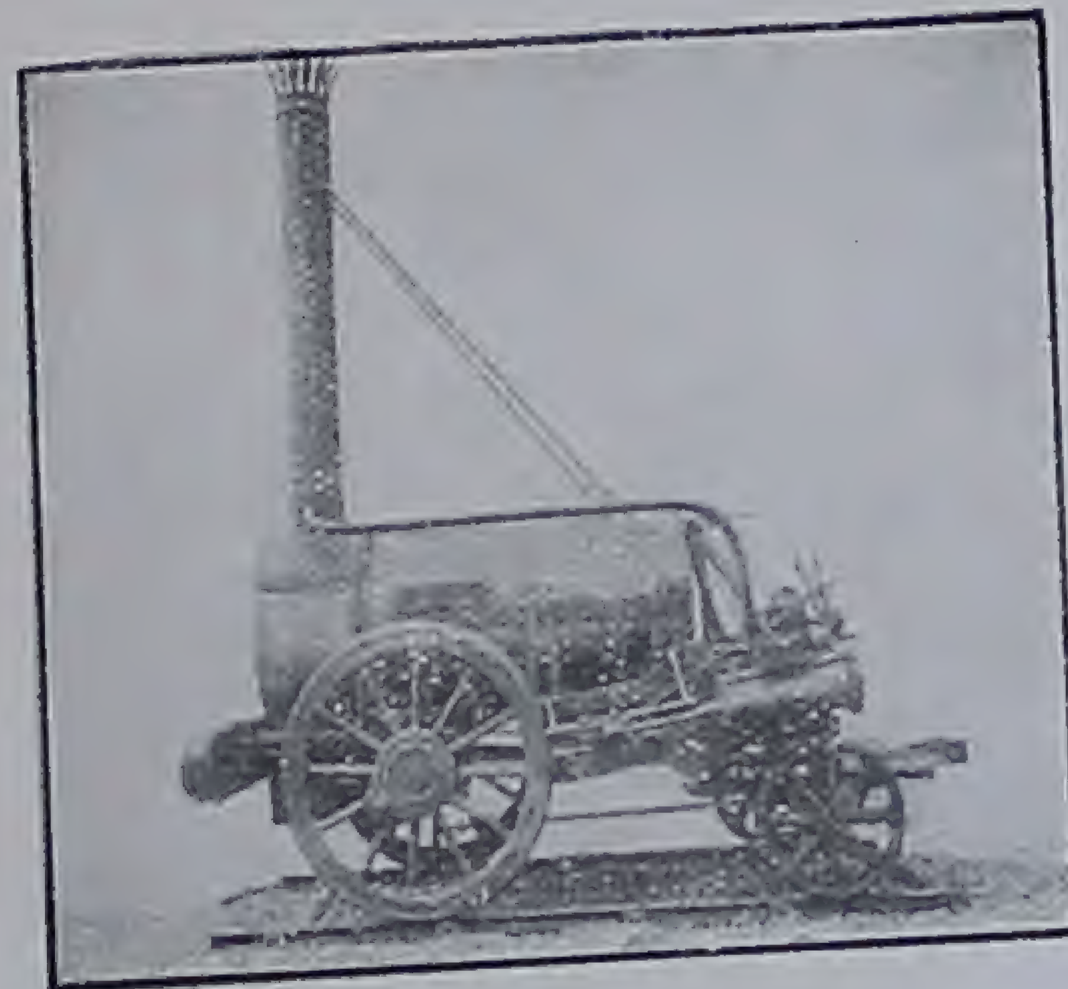
جدید مغربی تہذیب

مغربی تہذیب اس وقت دنیا کی سب سے بڑی قوت ہے، اور اس کا جو پھیلاؤ ہے وہ کسی پچھلی تہذیب کو نصیب نہیں ہوا، اس کے سوا ہو کیا سکتا تھا؟ مغربی سیاست نے ایک جاپان کے چھوٹے سے ملک کو چھوڑ کر جہاں کہیں کسی کو کام کرتے دیکھا اس کے ہاتھ پیر باندھ دئے، تاکہ مغربی صنعت کے سوا ضرورت اور آرام کی چیزیں حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ رہے، دوسری طرف مغربی تہذیب نے جہاں کہیں کسی اور تہذیب کا چراغ جلتے دیکھا اسے بجھا دیا، اور دنیا کے لئے اپنی روشنی کے سوا اندھیرے سے بچنے کے لئے کوئی اور چارہ نہ رکھا۔ مغربی تہذیب کے بے رحم دل نے دشمنوں کو اپنا غلام بنا کر چھوڑا ہے اور شیدائیوں کو اپنی اداؤں اور حسین صورت سے لبھا کر ان کے گھر تک

بکوالئے ہیں۔ اب دنیا پر اس کا راج نہ ہو تو کس کا ہو۔

لیکن اگر دنیا کے ایک حصے میں مغربی تہذیب کا برتاؤ اس عورت کا سا ہی جو مال دولت لے کر لمبی پڑتی ہی تو ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ یہ ادا اس نے حال ہی میں سیکھی ہی، اور ہم اس کو اسی ایک پہلو سے دیکھ کر پہچان نہیں سکتے وہ صرف اپنے پھیلاؤ کی وجہ سے نہیں بلکہ طبیعت سے بھی بے چین اور بے قرار رہتی ہے اور جب تک اس کی رگوں میں خون ہے اس کے چہرہ کا رنگ بدلتا رہے گا۔ ہندوستانی فلسفے یا چینی اخلاق کی طرح وہ ایک چٹان نہیں ہی کہ جس سے زمانے کی موجیں ٹکرا کر پاش پاش ہوتی رہیں، بلکہ خود ایک سمندر ہی اور موجوں اور طوفانوں کو اپنی گود میں پالتی رہی ہی۔ اگر اس وقت اسے ناگوار ہی کہ اس کی قوت اور حسن کے سوا کچھ اور نظر آئے، تو وہ سچ مچ قوت اور حسن کی دیوی ہی بھی۔

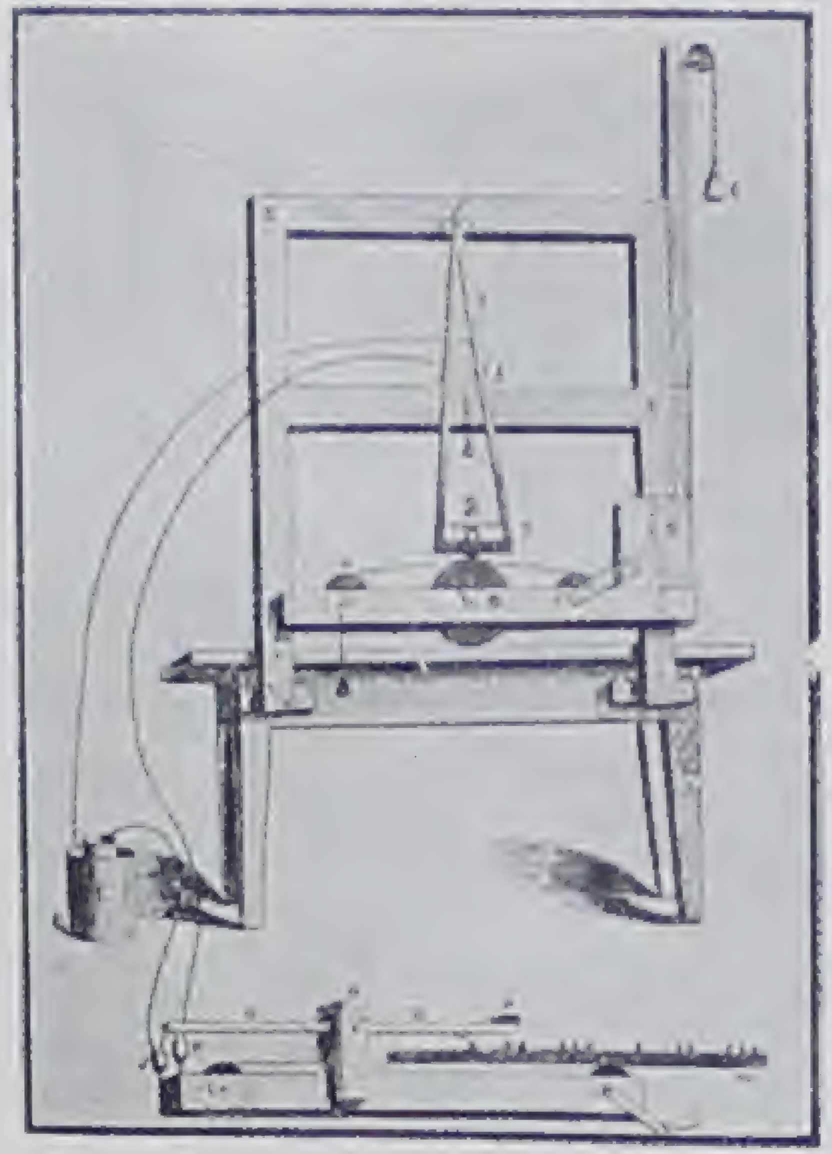
مغربی تہذیب کی صورت پہلے پہل ہمیں اٹلی میں چودھویں اور پندرھویں صدی میں نظر آتی ہی۔ تب وہ ایک خاص وضع کی انسانیت تھی جب کا سر تو گرجامیں پادریوں کے سامنے جھکا ہوا تھا اور دل یونان کے مندروں اور ان کی رنگیلی دیویوں میں الجھا ہوا تھا، اور اسے فکر تھی کہ ایسا کوئی نیا شوالہ بنائے جس میں عیسائی مذہب کا جوش اور یونانی زندگی کا حسن دونوں پجاری

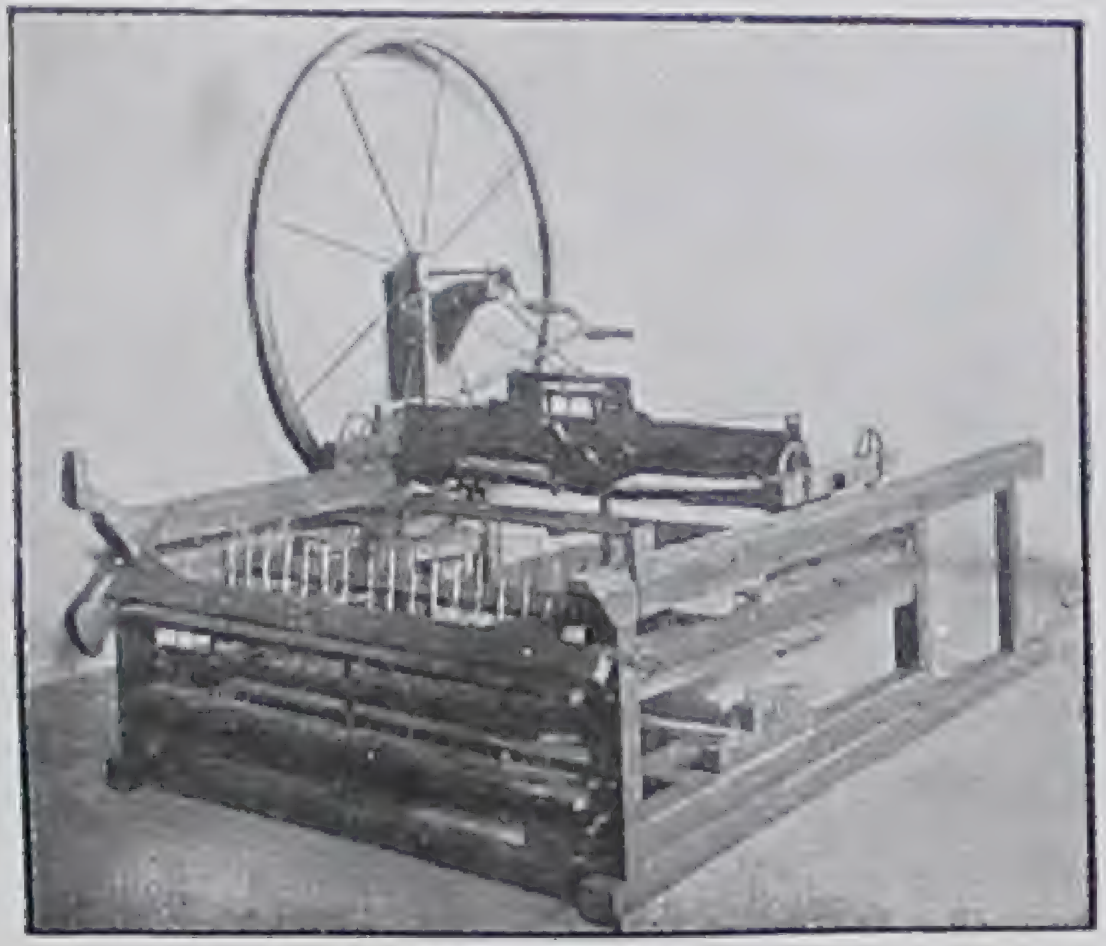


سب سے پہلا انجن



سب سے پہلا جہاز





کپڑا بننے کی پہلی مشینیں

کے شوق اور اشتیاق کو بڑھائیں۔ یہ کوشش مصوری میں، عمارتوں میں اور چند لوگوں کے اخلاق میں تو ہیں کامیاب نظر آتی ہے، کہ اس وقت کی سی تصویریں اور عمارتیں یورپ والے پھر کبھی بنا نہ سکے، لیکن یونانی تہذیب کے نشے میں چور ہونے پر بھی عیسائی مذہب اور عیسائی کلیسا نے کٹرپن اور حکومت کی لت کو نہ چھوڑا، اور اٹلی کی زندگی پر نئی تہذیب کا کچھ ایسا الٹا اثر پڑا کہ وہ اندر سے سڑ گئی۔ اٹلی کی دولت کو فرانس والے لوٹ لے گئے، اور تہذیب کی وہ قلم جو وہاں نہیں لگ سکی تھی، اُنھوں نے اپنے یہاں لگانے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی ایک جرمن مصلح لوتر کی ہمت نے پرانے مذہب کے طلسم کو توڑا اور یونان کے کھنڈروں سے نہیں بلکہ یورپی قوموں کے نوجوان دلوں کی بستی سے ایک نئی زندگی کی صدا اٹھی جس میں سوئی ہوئی قوموں کو جگانے کی زیادہ صلاحیت تھی۔ اس ایک جرمن کی ہمت اور اس کا اپنے دل پر بھروسا کر سکنا ایک مثال تھی جس نے آہستہ آہستہ اپنا اثر دکھایا، اور لوگوں میں دل کی بات ماننے اور غیر کا کہنا نہ ماننے کی وہ قوت پیدا کی جو یورپی تہذیب کی ایک بڑی آن بان ہے۔

لیکن کوئی دو سو برس تک یورپ کی ظاہری صورت اٹلی اور قدیم یونان کے فرانسیسی نقال بناتے رہے، اور سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں یورپ کی تہذیب دراصل فرانسیسی تہذیب تھی۔ رہن سہن میں، پہناوے میں، زندگی کے

آداب اور تکلفات میں فرانسیسی دربار اور شریف خاندانوں کے رواج کی نقل کی جاتی تھی۔ تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے فرانسیسی جاننا ضروری تھا، اور ادب اور فنون لطیفہ میں سب فرانسیسی مذاق کو رہبر مانتے تھے۔ لیکن اس تہذیب میں بناوٹ بہت تھی، بلکہ یوں کہئے اس میں بناوٹ کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔ مردانے کپڑوں میں بھی لیس اور جھالر، شوخ رنگ کے ریشم اور مخمل کا رواج عام تھا۔ مصنوعی بال لگا کر ان پر پاؤڈر چھڑکنا، گالوں پر کپڑے کے تل چپکانا بھلے مانسوں کی صورت بنانے کے لئے لازمی تھا، مردوں کو بناؤ سنگھار میں کئی گھنٹے لگ جاتے تھے اور عورتوں کی ساری عمر اسی کی نذر ہوتی تھی۔ سجاوٹ کے لئے چمکتے ہوئے سنہرے اور روپہلے پھول پتوں کی بھرمار ضروری سمجھی جاتی تھی، اور کسی طرح کی سادگی دماغ یا جیب کے خالی ہونے کی دلیل تھی۔ مگر اس تہذیب کے نام لیوا قسم کھاتے تھے یونان اور روم کی، اور اسی میں وہ بگڑے گئے۔ جیسے پرانے مذہب کو یونانی اور لاطینی زبان کے چرچے نے ڈھایا، اس لئے کہ لوگ انجیل پڑھ کر خود اس کا مطلب نکال سکتے تھے، ویسے ہی اس تہذیب کے مخالف یونانی اور رومی تہذیب کی سادگی اور سچائی کو اس کی بناوٹ اور جھوٹ کے مقابلے پر لائے، اور ایک منچلے فرانسیسی، روسو نے سادہ اور آسان زندگی اور سچے اخلاق کا ایک دھرم بنایا جس نے بناوٹ ہی کو نہیں دور کیا بلکہ آدمیت کی ایک

نئی اور بہت ہی پیاری تصویر کھینچی جس پر اپنے اپنے مزاج کی مناسبت سے یورپ کی قوم کی قومیں عاشق ہوگئیں تعصب اور کٹرپن کی مخالفت برابر جاری رہی تھی، اور جب اٹھارویں صدی کے آخر میں فرانس کا عظیم الشان انقلاب ہوا تو تہذیب کی یہ نئی تحریک بھی ان تمام ملکوں میں پہنچ گئی جن پر پہلے فرانسیسی تہذیب کا اثر تھا۔

روسوٗ خود کوئی بہت بڑا آدمی نہیں تھا، لیکن اس نے جو بات کہی کہ یہ تمھاری تہذیب اور اس کی رسمیں، یہ نفاست اور بھڑک چمک، یہ آداب اور تکلفات سب ایک دھوکا اور ڈھکوسلا ہیں، یہ تم کو آدمی نہیں بنا سکتے، بلکہ اگر تم آدمی ہو بھی تو تمھیں گڑیا گڈے بنا دیں گے، آدمی کی شان تو اس میں ہی کہ اپنے آپ کو پہچانے اور اپنی قدر کرے، اور تہذیب کے ہر دب اور زندگی کے ہر اُس قاعدے کو جو اسے آدمی بننے سے روکتا ہو مٹا دے، یہ بات بہت سے دلوں کو لگی۔ اس نے لوگوں کو ایک بنی بنائی تہذیب میں ڈگری حاصل کرنے کے بجائے اپنی اور دوسروں کی آدمیت اور شخصیت کو ڈھونڈھنے اور پرکھنے میں لگا دیا، اور یہی سرگردانی اور جستجو ایک نئی تہذیب کا سرچشمہ بن گئی فلسفے میں کانٹ، ادب میں گوئٹے، موسیقی میں بے تھوون نے ایک نیا اور سچّا معیار قائم کیا، اور فرانسیسی انقلاب نے یورپ والوں پر یہ ظاہر کر دیا

کہ آدمی آزاد ہے، اور وہ آزاد نہ ہو تو آدمی نہیں ہو سکتا۔ مذہب میں بھی تعصب اور توہمات کو آہستہ آہستہ نکالنے کے بعد جو حقیقت باقی رہ گئی تھی وہ یہ تھی کہ قدرت کی نیرنگیوں اور انسان کے حوصلوں میں روپ لینا خدا کی شان ہے، اور انسان کا اپنی اصلیت پہچاننا، اپنی اور اپنے ہم جنسوں کی کمزوریوں اور مجبوریوں کو دور کرنا مذہب کی جان۔ انسان کو موت نہیں مارتی بلکہ قناعت اور ہمت کی پستی، اس کا قید خانہ وہ تقدیر نہیں ہے جس کا اٹل ہونا مشہور ہے بلکہ وہ ناکام تدبیر جسے وہ خود غرضی یا کاہلی میں تقدیر سمجھ بیٹھتا ہے یورپ کی اس نئی تہذیب کا خاص کام عقل اور حوصلے کو ابھارنا اور آدمی کی یہ عادت ڈالنا تھا کہ وہ اپنی طبیعت کو زندگی کے سانچے میں نہ ڈھالے بلکہ زندگی کو اپنی طبیعت اور خواہشوں کے سانچے میں۔

یہ نئی تہذیب شروع میں یورپی تھی یعنی اس پر قومیت کا اثر نہیں تھا اور وہ اسے تسلیم بھی نہیں کرتی تھی کہ آدمیوں کو قوموں کے اعتبار سے تقسیم کرنا چاہیے۔ لیکن فرانس اور جرمنی کی لڑائیوں نے قوموں کی اس تنظیم نے جو صنعتی اور تجارتی کامیابی کے لئے ضروری تھی اور آخر میں اس مقابلے نے جو یورپی قوموں میں تجارتی منڈیوں پر قبضہ کرنے کے لئے ہوا اور جس کا نتیجہ پچھلی جنگ عظیم تھی، قومیت کے احساس کو بہت بڑھا دیا، اور الگ الگ آدمیوں سے

وہ آزادی چھین کر جو تہذیب اور اخلاق نے انھیں دی تھی، سب کو صنعت اور سیاست کی مشین کے پُرزے بنا دیا۔ اب روشن خیال آدمی اس کا دکھڑا روتے ہیں کہ قانون جو آزادی دیتا ہے وہ بالکل ایک دھوکا ہے، اور آدمی قومی اغراض کے، عام رائے کے، صنعتی تنظیم کے ایسے پابند ہو گئے ہیں کہ ان میں سچ اور خودی نام کو بھی نہیں رہی ہے۔ جیسے بڑی بڑی مشینیں ایک نمونے کی لاکھوں چیزیں بناتی ہیں، ویسے ہی تعلیم اور عادت اور ضرورت مل کر ایک ہی نمونے کے لاکھوں آدمی بنا دیتی ہیں۔ جو کاروبار ہی میں نہیں بلکہ مذاق اور خیالات میں قاعدے کی پابندی کرتے ہیں، اور ان کا جینا اور مرنا بھی اسی کے مطابق ہوتا ہے۔ انسانیت کے اچھے نمونے چننا اور ان کی نقل کروانا پہلے بھی تہذیب کا کام تھا، مگر پہلے یہ نمونے بہتر سے بہتر اور قیمتی سے قیمتی ہوتے تھے، اور اب اس کی فکر رہتی ہے کہ آدمی کی ہر خوبی جلد سے جلد حاصل ہو اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو پسند آئے۔ آپ کو علم اور ادب اور آرٹ کے ایسے قدردان ملیں گے جو ان کے ذریعے سے آدمی کی طبیعت میں گہرائی اور اس کے مذاق میں سچائی پیدا کرنا چاہتے ہیں، جو ہر چیز کو بازار کے بھاؤ کا خیال رکھ کر نہیں پرکھتے، جن کے نزدیک قوم اور نسل کا فرق غلط ہے، اور جو قومی فائدے کے نام سے بھی ایسا سودا نہیں کرنا چاہتے

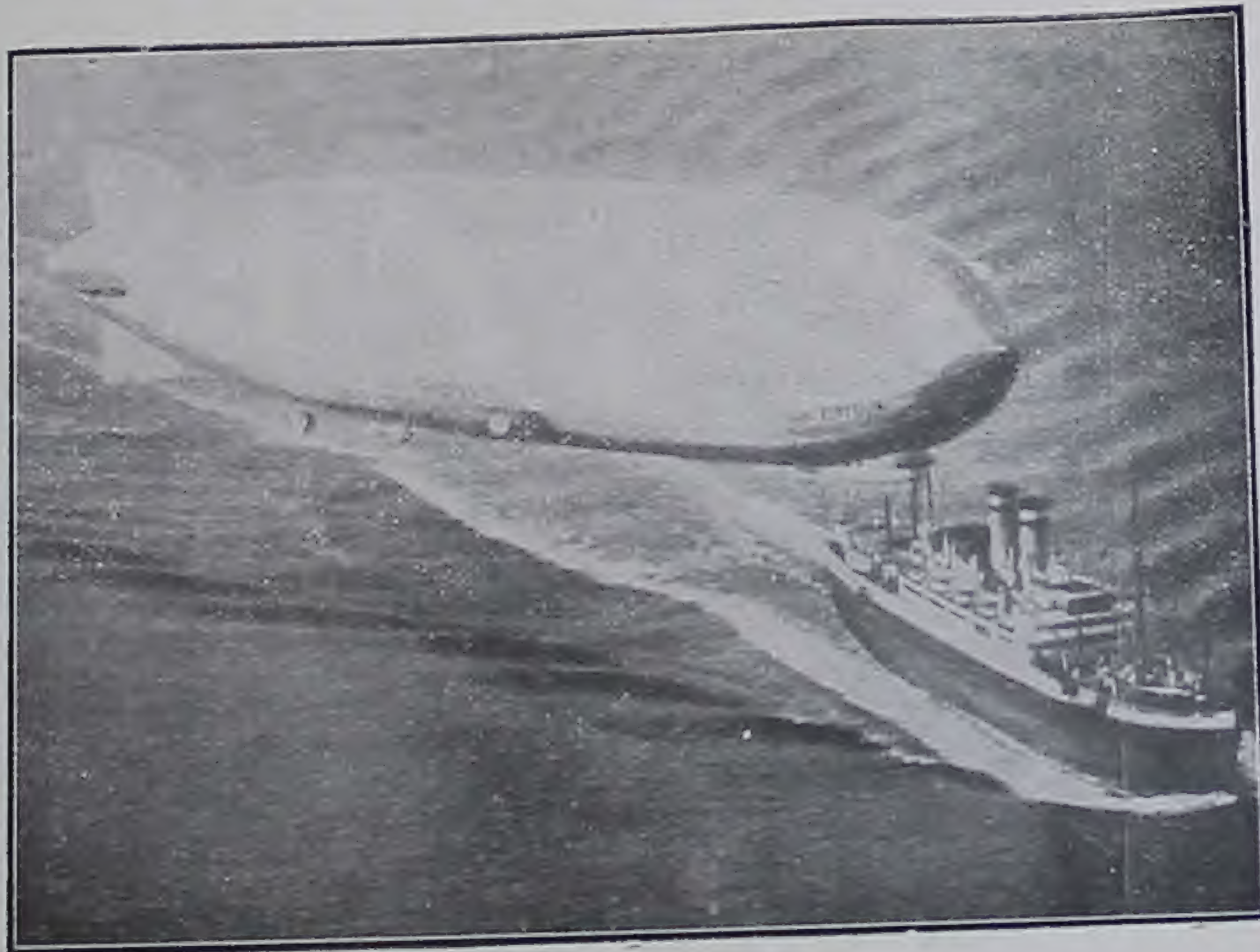
جس میں کسی دوسرے کا نقصان ہی نقصان ہو۔ لیکن ایسے لوگ کم ہیں اور وہ بھی شاید دل میں سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں بس کہنے کی باتیں ہیں، اور مغربی تہذیب کی ایک چول بھی ڈھیلی ہوئی تو اس کا سارا نظام بگڑ جائے گا۔

یورپی تہذیب کا اٹھان بڑا زبردست تھا، اور کوئی ڈیڑھ سو برس کے اندر یعنی ۱۷۰۰ء سے ۱۸۴۸ء تک اس نے ایسی شخصیتیں پیدا کیں جنھوں نے زندگی کو جگمگا دیا، لیکن پھر وہی ترقی کے حوصلے جنھوں نے اسے بیدار کیا تھا اور ترقی کے رستے پر بہت دور تک پہنچا چکے تھے اس کے پانو کی زنجیر بن گئے۔ آپ کو یقین نہ آئے گا، اور مجھے بھی اسے ماننے میں برسوں تک تامل رہا، مگر یہ واقعہ ہے کہ یورپ میں ۱۸۴۸ء کے بعد کوئی ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی جس نے اپنی طبیعت کے زور یا اپج سے علم یا فن یا سیاست ہی کو کوئی نیا ڈھب سکھایا یا کسی نئے رستے پر لگایا۔ اس کے بعد بھی آپ کو بہت بڑے آدمی ملیں گے، جیسے بسمارک کارل مارکس، ابسن، لیکن ان سب کی پرورش اس زمانے میں ہوئی جب حوصلے نے زندگی کو ایڑ تو لگائی تھی مگر اس پر قومیت کا چارجامہ نہیں کسا گیا تھا، اور صنعتی اغراض کی لگام بھی اس کے منہ میں نہیں تھی۔ ۱۸۴۸ء

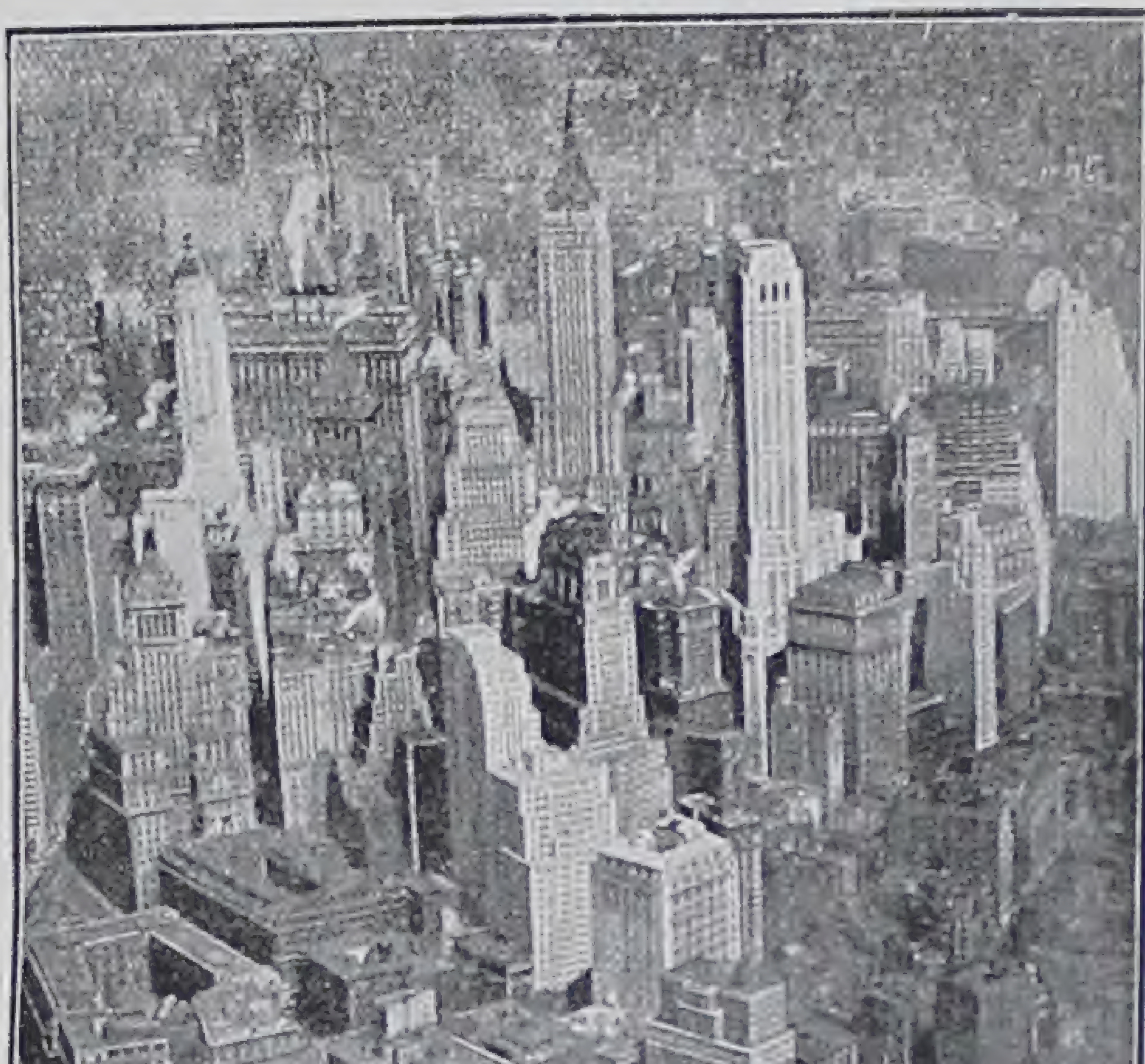
سے قومیت اور صنعت نے زور باندھا، اور انھوں نے انسان اور تہذیب کی باڑھ ماردی۔

بے شک ترقی ہوتی رہی۔ علم میں، سائنس میں، قدرت کو قابو میں کرنے اور انسان کو دنیا کا بادشاہ بنانے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی لیکن یہ کام اس طرح کا تھا جیسے مکھیوں کا شہد جمع کرنا۔ عالموں نے معلومات کا ایک بہت بڑا خزانہ جمع کیا، مگر اس سے انسان سمجھئے کچھ گھاٹے ہی میں رہا، کہ اس نئے علم نے وہ تمام نشانیاں مٹا دیں جن پر انسانیت کا بھروسہ تھا، اور انسان کو عادت کا، جبلت کا، ملک اور آب وہوا کا، خود غرضی اور بھوک کا بنایا ہوا پتلا ثابت کیا۔ یہ علم خود بھی معلومات کا ذخیرہ بڑھانے کی فکر اور غلط اور صحیح کی بحث میں اس طرح الجھ گیا ہے کہ وہ زندگی اور حوصلے کے لئے نئے میدان تلاش کرنے کے فرض کو بالکل ہی بھلا بیٹھا ہے۔ سائنس، اور خصوصاً صنعتی سائنس نے علم سے بھی زیادہ ترقی کی ہے، مگر سائنس کو اخلاق سے کوئی مطلب نہیں، اور مذہب سے اس کو للّٰہی عداوت ہے۔ اصل میں قومیت اور صنعت سائنس کو اپنے دھارے میں بہائے لئے جا رہی ہیں۔ اور علم بھی اگر منجدھار میں نہیں ہے تو کنارے سے تو بہت دور ہے۔ یورپ کا قومی اور صنعتی نظام بگڑا، اور اس کے لچھن ایسے ہیں کہ وہ بہت جلد بگڑے گا بھی ضرور، تو علم اور سائنس دونوں اپنی خیر منائیں گے۔

یورپ اور امریکہ کے صنعتی نظام سے میری مراد اکیلی سرمایہ داری نہیں ہے۔ بلکہ رہن سہن کا وہ ڈھنگ جس میں کارخانے اور بازاری زندگی کے قاعدے قانون بناتے ہیں، انسان کی طبیعت اور حوصلہ پر چھائے ہوئے ہیں، اور اسے اپنی اغراض میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ وہ ہاتھ پاؤں بھی نہیں مار سکتا۔ نئی صنعت نے تہذیب پر بڑے بڑے احسان کئے ہیں اسی کی بدولت یورپ میں تعلیم عام ہوگئی ہے، اخبار ہیں، کتابیں ہیں، ڈاک کا، تار کا انتظام ہے، ریل، جہاز، ہوائی جہاز چند مہینوں میں آدمی کو اتنی سیر کرا سکتے ہیں جو پہلے عمر بھر میں نہ ہو سکتی، اور ان سب کے علاوہ ہزاروں آسانیاں ہیں جو ضروریات پوری کرنے کے بار کو بہت ہلکا کر دیتی ہیں، سینکڑوں ہسپتال ہیں، صفائی ہے، لوگوں کو تندرست اور خوش رکھنے کی پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ فکر ہے۔ کارخانے کے معمول اور تجارتی کامیابی کے اصول نے لوگوں کو قاعدہ کا، وقت کا پابند بنایا ہے، اور اگرچہ زندگی کا پیمانہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ جس کا قیاس کرنا بھی مشکل ہے، سارا کام بغیر کسی رکاوٹ کے، سہولت سے چلتا رہتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کا بھی خیال رکھئے کہ نئی صنعت ساری قدرت کا رس چوسنے کے ساتھ آدمی کا خون بھی چوستی ہے، اور اگر آپ یہ نہیں سمجھتے کہ ایک کو سکھ پہنچانے کے لئے دس کا دکھ سہنا انصاف کی بات ہے، تو یہ سوچئے کہ ان لاکھوں کروڑوں آدمیوں پر کیا گذرتی ہے جو اپنی عمر کوئلہ کی کانوں میں یا



ہوائی جہاز اور زیپلن



نیو یارک

لوہے کے کارخانوں میں گذارتے ہیں۔ اور یہی نہیں، صنعت جس کو ترقی کہتے ہیں اس میں آدمیت کا خاصا نقصان بھی ہوتا ہے۔ مثلاً گرمیوفون اور سینما اور ریڈیو نے گانے اور ایکٹنگ کے فن کو ستیاناس، آرٹسٹ کو ذلیل اور مذاق کو اوچھا کر دیا ہے اور اکیلی دوکانداری میں نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں کامیابی کا دارومدار اشتہار پر ہو گیا ہے۔ بہت سی نعمتیں جو پہلے کم لوگوں کو نصیب ہوتی تھیں اب بہت زیادہ کو میسر ہیں۔ لیکن سچ پوچھئے تو یہ نعمتیں نہیں رہی ہیں، ایک طرح کا دھوکا ہیں، کہ جس میں لطف اسی کو آ سکتا ہے جسے لت ہو، سچا شوق رکھنے والا تو الٹا کڑھتا ہے۔

ہاں اور آخری بات یہ کہ مغرب کی صنعتی ترقی یورپ اور امریکہ والوں کی اپنی ہی کمائی نہیں ہے، اس دولت کے پیدا کرنے میں بہتیروں کا حق مارا گیا ہے، اور وہ ملک جو اب تجارتی منڈیاں کہلاتے ہیں کارخانے بن گئے تو مغربی صنعت کا ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا۔ لیکن جب سیاسی چالیں اور صنعتی ضدیں اپنا کام کر چکیں گی اور دولت اور حکومت کا نشہ اتر جائے گا تو شاید وہ روشنی پھر چمک اٹھے گی جو اب کارخانوں کے دھوئیں اور قومی خودغرضیوں کی طوفانی گھٹاؤں میں چھپ گئی ہے، اس تنظیم کی قدر کچھ کم ہو گی جس میں انسان ایک کل کا پرزا بن گیا ہے۔ اور اس کا دل پھر اپنے اندر نئے میدان تلاش کرے گا۔

(۱۷)

آج کی دُنیا

یورپ کے صنعتی نظام کا وہاں کی معاشرت اور تہذیب پر جو اثر پڑا اس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ لیکن صنعتی تنظیم کے نقش اس سے کہیں زیادہ گہرے ہیں جتنی کہ رہن سہن اور خیالات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانے کی تمام سیاسی اور تمدنی تحریکیں اسی طرف چلتی ہیں جدھر یہ صنعتی تنظیم انھیں لے جائے، پہلے اگر یہ زندگی کا ایک مظہر تھی تو اب خود زندگی اس کا مظہر بن کر رہ گئی ہے، یہ قائم اور ترقی پر رہی تو مغربی تہذیب قائم اور ترقی کرتی رہے گی، یہ کسی وجہ سے بگڑی تو اس کے ساتھ سب ہی کچھ برباد ہو جائے گا۔

یورپ کے فلسفہ حیات پر صنعتی تنظیم کا عکس سب سے پہلے سوشلزم یا اشتراکیت کی تعلیم میں نظر آتا ہے۔ شروع میں سوشلزم پر شاعری اور اخلاق، یعنی

انسانیت کا رنگ غالب تھا، اور یہ معاشرت اور تہذیب کی ایک نئی طرح ڈالنے کی کوشش تھی۔ پھر یہ صنعتی تنظیم کی نئی شکلیں پیش کرنے کے پھیر میں اس طرح پڑ گئی کہ اس کے سر پر کارخانے کا بھوت اور کاروبار کا سودا سوار ہو گیا۔ کارل مارکس کے ہاتھوں یہ ایک خالص علم بن گئی، یہ ایک ایسا علم جو پوری زندگی پر حاوی تھا۔ اس کی بنیاد بے شک انسانی ہمدردی پر تھی، کہ نفع حاصل کرنے اور دولت پیدا کرنے کی کوشش میں غریب مزدوروں پر جو ستم ڈھائے ہیں ان کا خیال بھی کیجیے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، دنیا تنگ اور تاریک ہو جاتی ہے اور بے طرح دم گھٹنے لگتا ہے۔ لیکن کارل مارکس کی تعلیم نے بے بس، مجبور اور مظلوم انسان کو آزادی کی ہوا نہیں دی، بلکہ اسے اپنے اختیار پر جو ذرا سا بھروسا تھا اسے بھی چھین لیا۔ اس کی تعلیم ہے کہ انسانی زندگی ماحول کی پابند ہوتی ہے، ماحول ایک طرف قدرت کا اور دوسری طرف صنعتی اور معاشی نظام کا پابند ہوتا ہے، صنعتی اور معاشی نظام خود ارتقار کے ایک قانون پر چلتا ہے اور اس کا پابند ہے۔ مذہب اور اخلاق ماحول کا آئینہ ہوتے ہیں اور جسے وہ نیک زندگی اور سچا حوصلہ کہتے ہیں وہ دراصل معاشی نظام اور تقسیم دولت کے مروّجہ اصول کو قائم رکھنے کی غیر شعوری تدبیریں ہیں۔ رہا انسان سو وہ بھی قوت حیات کا ایک مظہر ہے، اور اسے

اپنی فلاح و بہبودی حاصل کرنے کا اتنا ہی اختیار ہے جتنا پیاسی کھیتی کو پانی برسانے کا. ظلم سے نجات نوعِ انسانی کو ضرور ملے گی، لیکن اپنی کوشش سے نہیں بلکہ اسی قانون کی بدولت جو اب تک ظلم کراتا رہا ہے۔ دنیا میں سرمایہ اور اختیار خود بخود سمٹ کر چند لوگوں کے ہاتھ میں پہنچ جائے گا، مزدوروں کی تعداد اور اُن کی مظلومیت بڑھتی رہے گی یہاں تک کہ وہ ایک دن جوش میں آ کر سرمایہ داروں کا خاتمہ کر دیں گے اور دنیا کے مالک بن جائیں گے۔

ایک اشتراکی انقلاب تو ہوا ہے، لیکن ایسے ملک میں نہیں جہاں صنعت نے ترقی کی تھی بلکہ روس میں، جہاں سرمایہ داری کی بس ابتدا ہوئی تھی، جو زمینداروں اور کسانوں کا ملک تھا، کارخانوں اور مزدوروں کا نہ تھا۔ اور یہ انقلاب ہوا اس سبب سے کہ روس کے روشن ضمیر لوگ شاہی حکومت کی بے رحمی اور جہالت سے بیزار تھے۔ اس کا سلسلہ یورپ کی صنعتی تنظیم اور سوشلزم کی تعلیم سے نہیں ملتا بلکہ روس کو آزاد کرنے کی اس دُھن سے جو قریب ایک سو برس سے قوم پرست روسیوں میں سمائی ہوئی ہے۔ جنگ عظیم کے دوران میں جب شاہی حکومت لڑکھڑا کر گری تو انقلابیوں کی ایک جماعت کو جس نے سوشلزم کی تعلیم قبول کر لی تھی اور جس کا سردار لینن تھا، حکومت پر قبضہ کرنے کا موقع ملا اور ایک آزمائش کے بعد جو دنیا کی تاریخ میں یادگار رہے گی

روس میں مزدوروں اور کسانوں کی "ریاست قائم ہوئی۔ اس کے بانی لینن نے جو کارل مارکس کا پیرو مگر اس سے کہیں زیادہ وسیع نظر اور اعلیٰ شخصیت رکھنے والا آدمی تھا، عملی مصلحت اور حکمت کو بے لوچ منطق کے کٹہرے میں قید نہیں کیا۔ روسی ریاست اصولی نقطۂ نظر سے ایک مکمل سوشلسٹ ریاست نہ ہو سکتی تھی اور نہ ہوئی اور اب بھی اس میں سارا اختیار کمیونسٹ پارٹی اور اس کے لیڈر استالن کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن انقلاب کی بدولت روسیوں نے ترقی کی کئی منزلیں ایک چھلانگ میں طے کر لیں، اور وہاں رفاہ عام کے سینکڑوں ایسے منصوبوں پر عمل کیا جا رہا ہے، قدرتی ذخیروں سے فائدہ اٹھانے صنعت کو فروغ دینے اور مہذب زندگی کی زیادہ سے زیادہ نعمتیں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کی ایسی کوششیں کی جا رہی ہیں کہ روس بہت جلد دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور آسودہ حال ملکوں میں شمار کیا جانے لگے گا۔ تمدن اور صنعت میں وہ اب بھی ممتاز یورپی ملکوں کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا، وہاں اتنی آزادی نہیں ہے جتنی کہ جمہوری ریاستوں میں سیاسی مخالفتیں وہاں اب بھی گولی مار کر مٹائی جاتی ہیں، مزدور اور کسان جو بات سمجھانے سے نہیں سمجھتے وہ انھیں بھی ڈنڈے سے سمجھائی جاتی ہے۔ وہاں مزدوروں کو اجرت کم ملتی ہے، ان سے اپنی سبھائیں بنانے کا حق

چھین لیا گیا ہے، اور نام چاہے ان کا ہو، معتبر لوگوں کے مشاہدوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں آہستہ آہستہ ایک "متوسط طبقہ" پیدا ہو رہا ہے جو اپنے نمائندوں کے ذریعے سے اپنی مصلحتوں کے مطابق ملک پر حکومت کرے گا۔ یورپی ملکوں کے متوسط طبقے کے مقابلے میں اس کی تربیت بہت بہتر معاشرتی اصولوں پر ہو رہی ہے، اس میں جانبازی ہے، منچلہ پن ہے اور محنت اور ایثار کا مادّہ ہے جو انقلاب کے بغیر ہرگز نہ ابھر پاتا۔ شاید یہی انقلاب کا سب سے اچھا اور اہم نتیجہ بھی ہے۔

یورپ کے ترقی یافتہ ملکوں میں سوشلسٹ انقلاب نہیں ہوا۔ کارل مارکس کی پیشین گوئی کے خلاف وہاں مزدوروں کی حالت بدتر ہونے کی بجائے بہتر ہوتی گئی، اور ہنر سیکھے اور بن سیکھے مزدوروں کا فرق جو ان کے اتحاد میں شروع سے حائل ہوتا رہا ہے کسی طرح سے مٹایا نہ جا سکا۔ آہستہ آہستہ صنعتی ترقی کے ایک اور سلسلہ نے جس کا کارل مارکس کو اندازہ نہ تھا سرمایہ دار کو مزدور کے قابو سے باہر کر دیا ہے، یعنی ہزاروں کام جن کے لئے پہلے مزدور رکھے جاتے تھے اب مشینوں کے ذریعے سے ہوتے ہیں، اور ان مشینوں کو بنانے اور چلانے والے متوسط طبقے کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہیں جن کی ساری ہمدردی سرمایہ داری نظام کے ساتھ ہے۔ ہڑتال مزدوروں

کا ایک بڑا کارگر ہتھیار تھا، سو وہ بھی ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہے، اور یہ بارہا دیکھا جا چکا ہے کہ مزدور کام سے انکار کرتے ہیں تو ان کی جگہ متوسط طبقے کے نوجوان کام کرنے کو پہنچ جاتے ہیں۔ مزدور اب سرمایہ داری نظام میں تھوڑی سی بے چینی پیدا کر سکتے ہیں، مگر اسے مٹا دینا ان کے بس میں نہیں ہیں۔

لیکن ایک انقلاب یورپ میں بھی ہوا ہے جسے ایک پہلو سے دیکھئے تو وہ آزاد سرمایہ داری مقابلے کا جواب ہے، اور دوسرے پہلو سے دیکھئے تو سوشلزم کا ردعمل ہے۔ اس نے قومیت کو ایسا گہرا رنگ دیدیا ہی جو مذاق اور خیال اور عادت سب پر چڑھ گیا ہے، اس نے جمہوریت کے آداب کو بے معنی تکلفات اور جمہوری اداروں کو ضعیفی اور بے بسی کی علامتیں قرار دیکر ٹھکرا دیا ہے، ملک پر ایک پارٹی کی، پارٹی پر ایک شخص کی حکومت قائم کی ہے۔ اور قومی حوصلوں کو مذہب اور اخلاق سے بھی بڑھ کر مرتبہ دیدیا ہی۔ یہ انقلاب ترکی، اٹلی اور جرمنی میں سب سے زیادہ نمایاں ہی، ترکی میں اسے کوئی نام نہیں دیا گیا، جرمنی اور اٹلی میں اسے فاشزم کہتے ہیں۔ برطانوی سامراج امریکہ اور فرانس اس کے اثر سے بہت کچھ بچے ہوتے ہیں، لیکن اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ وہ کب تک اس سے بچے رہیں گے۔

اس انقلاب کا ایک سبب سرمایہ داری اور ملوکیت کا وہ مقابلہ تھا

جس کی وجہ سے ۱۹۱۴ء میں یورپ کی سربرآوردہ قوموں میں جنگ ہوئی جنگ کے بعد انگلستان اور فرانس نے ہمیشہ کے لئے یورپ اور ایشیا کی سیاست اور تجارت پر غالب رہنے کی ہر ممکن تدبیر کی، آسٹریا کو ایسا توڑا کہ وہ پھر بھی جڑ نہ سکے، اور جرمنی کو اس طرح کچلا کہ برسوں تک سر نہ اٹھا سکے۔ لیکن تجارتی اور صنعتی عداوتیں صرف ایک حد تک برتی جا سکتی ہیں، اس کے آگے وہ الٹا نقصان پہنچانے لگتی ہیں۔ جرمنی کو تجارتی دنیا سے نکال دینا ناممکن تھا، اسی گرانے کے بعد سب اس پر مجبور ہوئے کہ اسے سہارا دے کر اٹھائیں، اور اب وہ اٹھ گیا ہے تو کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کہا سنا معاف کرنے پر کیسے آمادہ کرے۔ جرمنی نے اپنی سیاسی زندگی سے سوشلزم اور جمہوریت کے اثرات خارج کر کے اپنی طاقت بڑھائی ہے، لیکن فاشزم کی تحریک کو وہاں انگلستان اور فرانس کی سیاست نے سب سے زیادہ تقویت پہنچائی۔ اٹلی نے جنگ عظیم میں انگلستان اور فرانس کا ساتھ دیا، مگر ان دونوں نے مل کر مال غنیمت میں سے اس کا حصہ مار لیا اور اس پر اٹلی والوں کو بڑی سخت شکایت ہو گئی۔ لیکن اٹلی کے فاشست انقلاب کا اصل سبب ایک الجھن تھی جو حکومت کی پست ہمتی اور نااہلیت، کساد بازاری اور بیروزگاری نے پیدا کی تھی، اس الجھن کو دور کرنے کی ایک تدبیر یہ ہو سکتی تھی کہ

حکومت کھلم کھلا سوشلسٹ ہو جاتے اور سوشلسٹ اصولوں کے مطابق معاشی اور سیاسی زندگی کو تنظیم دے دوسری تدبیر یہ ہو سکتی تھی کہ حاکم طبقہ سوشلسٹ جماعت کو دبا دے، اور کامیاب حکومت کے سوا اور کسی معیار کا خیال نہ کرے۔ جرمنی اور اٹلی دونوں ملکوں میں جنگ عظیم کے بعد سوشلسٹ جماعت کو اس کا بہت اچھا موقع ملا تھا کہ حکومت اور صنعتی نظام پر قبضہ کر لے، لیکن اندرونی اختلافات، بزدلی اور پست حوصلگی نے اسے موقع سے فائدہ نہ اٹھانے دیا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ملکوں میں سوشلزم کا نام و نشان تک مٹا دیا۔

فاشسٹ حکومتوں نے سرمایہ داروں سے وہ تمام اختیارات چھین لئے جو انھیں جمہوری دستور اور پرانی معاشی تعلیم کی بدولت حاصل تھے کہ اپنے کاروبار کو جس طرح چاہیں چلائیں اور بازار کی حالت دیکھ کر اسے گھٹائیں یا پھیلائیں۔ اب انھیں ریاست کی مرضی پر چلنا ہوتا ہے اور اس کے بدلے میں ریاست ان کے کاروبار کو قائم رکھنے اور اسے بڑھانے کی تدبیریں سوچنے کی ذمہ دار ہو گئی ہے۔ اس طرح سرمایہ داری اور ملوکیت، تجارت اور سیاست کا ایک دل اور ایک دماغ ہو گیا ہے اور دل و دماغ دونوں اس پر تلے ہیں کہ قوم کی حیثیت اور دولت کو بڑھائیں اور ترقی کی اس راہ میں جو رکاوٹیں ہوں انھیں جیسے بھی بن پڑے دور

کریں۔ اس طرح جرمنی اور اٹلی انگلستان اور فرانس کے مقابلے پر آگئے ہیں اور سیاسی فضا میں طوفان کی وہ تمام کیفیتیں پیدا ہو گئی ہیں جو جنگ عظیم سے پہلے نمودار ہوئی تھیں۔

اب آیئے اپنی کہانی ختم کرنے سے پہلے مشرق پر بھی ایک نظر ڈالیں۔ سترھویں صدی تک ترک سلطنت، جو ہنگری اور جنوبی روس سے افریقہ کے ریگستانوں تک اور یونان سے عراق تک پھیلی ہوئی تھی مشرقی دنیا کی پاسبانی کر رہی تھی، لیکن مغربی قومیں اس رستے پر قبضہ کرنا اپنے امکان سے باہر دیکھ کر دوسرے رستے تلاش کر چکی تھیں۔ ہسپانی وسط اور جنوبی امریکہ پہنچ گئے تھے، پرتگالی ہندوستان، اور یہاں بحر عرب میں ان کی قزاقی نے تجارت قریب قریب بند کر دی تھی۔ پرتگالیوں کے پیچھے ہالستانی اور انگریز ادھر پہنچے، اور ایک طرف ہندوستان اور جنوب مشرقی ایشیا سے ایمانداری اور بے ایمانی سے حاصل کی ہوئی دولت، دوسری طرف اس سونے چاندی نے جو امریکہ میں ہاتھ آئی یورپ کے لئے اتنا سرمایہ فراہم کر دیا کہ صنعتیں جنھوں نے عربوں سے فن کے پہلے سبق سیکھے تھے ترقی پا گئیں لیکن اٹھارہویں صدی کے وسط تک یورپ کا سرمایہ تجارتی تھا، صنعتی نہیں تھا یعنی مشرق سے مال لاکر مغربی ملکوں میں بیچنے، افریقہ سے حبشیوں کو پکڑ کر

امریکہ میں فروخت کرنے اور یورپی ملکوں میں ایک جگہ کا مال دوسری جگہ پہنچانے کے کاروبار میں لگا ہوا تھا۔ صنعتی وہ اس وقت ہوا جب انگلستان میں کارخانے قائم ہوئے اور مشینوں کے ذریعے سے بڑے پیمانے پر تجارتی مال تیار کیا جانے لگا۔ نئے تجارتی رستے دریافت ہونے سے مشرق قریب کے تاجروں کے ہاتھ سے ایک قسم کا کاروبار نکل گیا، بڑے پیمانے کی صنعت نے جس کی حفاظت نئی وضع کی بندوقیں اور نئے طریقے کی جنگ کرتی تھی ایک صدی کے اندر مشرقی صنعتوں کا خاتمہ کر دیا اور اس تباہی میں سیاسی زوال کی رفتار کو اور بھی تیز کر دیا۔ جنگ عظیم کے بعد دو تین سال، جب انگریز، فرانسیسی اور اطالوی مغربی ایشا کو اس طرح تقسیم کر رہے تھے جیسے ڈاکو لوٹ تقسیم کرتے ہیں، وہ زمانہ تھا جب مشرق اور خاص طور پر مسلمانوں کی پستی، اور ذلت انتہا کو پہنچی۔

لیکن دوسری طرف ابھرنے کی وہ کوششیں جو کوئی سو برس سے جاری تھیں اسی زمانے میں پہلے پھل لائیں۔ انیسویں صدی کے شروع میں وہابی تحریک نے اس دینی اور اخلاقی آپاہج پن کو دور کیا جو آرام، اطمینان اور خودپسندی نے پیدا کیا تھا، اور ساری اسلامی دنیا میں دینی بیداری کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اسی صدی کے وسط سے آخر تک سید جمال الدین افغانی

کی شخصیت صبح کی روشنی کی طرح سوتے ہوئے سیاسی احساسات اور جذبات کو جگاتی رہی اور کچھ ایسا کر گئی کہ پھر نیند یا غفلت کا طاری ہونا ممکن نہیں رہا۔ ترقی کے حوصلے سب سے پہلے ترکی میں نمودار ہوئے، کیونکہ یورپی قوموں کی مار سب سے زیادہ ان ہی پر پڑی تھی، اور سب سے بعد کو ہندوستان میں جہاں بزرگوں کے ایک گروہ نے طبیعت کی افتاد کے مطابق تجربے اور تحقیق سے یا قرآن اور حدیث سے ثابت کیا کہ مسلمانوں کی نجات انگریز کی خوشامد اور تابعداری، سرکاری ملازمت اور پنشن میں ہے۔

تجارت اور تمدن کے میدان میں متواتر شکست کھانے کے بعد جب مسلمان اس پر غور کرنے لگے کہ ان کے زوال کا سبب کیا ہے تو ان میں دو مختلف خیال کے لوگ پیدا ہو گئے، ایک تو وہ جو کہتے تھے، اور اب تک کہتے ہیں، کہ دنیا ہمارے ہاتھ سے اس لئے نکل گئی ہے کہ ہم نے دین کو چھوڑ دیا ہے، دوسرے وہ جو کہتے ہیں کہ ہم دنیا میں اس وجہ سے ذلیل ہوئے ہیں کہ خود ستائی اور بے بصیرت دینداری کے پھیر میں آکر ہم نے ان دنیاوی فرائض کو نظر انداز کیا ہے جن کو ادا کئے بغیر آبرو کی زندگی بسر کرنا ممکن نہیں۔ بات دونوں ٹھیک کہتے ہیں، اور ان میں جو اختلاف ہے وہ دونوں کی انتہا پسندی اور مبالغہ کی وجہ سے ہے۔

دینی فرائض کی اہمیت جتانے والے زمانے کی ضرورت اور عملی مصلحت سے اس درجہ بے پروا ہیں کہ ان کی ہدایت آگے بڑھنے کی تدبیریں بتانے سے معذور ہو گئی ہے۔ سیاست اور نئی معاشرت کے از دل ترقی کی ظاہری علامتوں میں ایسے اُلجھے ہیں کہ ان جذبات تک پہنچ نہیں پاتے جن پر زندگی اور حوصلے قائم ہوتے ہیں لیکن میدان اس وقت اسی خیال کے لوگوں کا ہے۔ کمال اتاترک نے یورپی ملوکیت کو پسپا کر کے، رضا شاہ نے ایران کو مغربی سرمایہ داری اور ملوکیت کے پنجے سے چھڑا کر ایسی دھاک بٹھائی ہے اور ایسا اختیار حاصل کر لیا ہے کہ ان کے دعوے کو غلط اور ان کے عمل کو مضر ثابت کر کے صرف ایک پیدائشی منطقی کو تسکین ہو سکتی ہے۔ اب مصر، شام، ترکی، ایران اور کچھ کم شدت کے ساتھ افغانستان میں ترقی کی صورت یہ مان لی گئی ہے کہ معاشرت، سیاست آدمیت کا مشرق میں وہی تصور رائج ہو جو مغربی ملکوں میں، اور تربیت اور عادت، شہریوں کی صلاحیت اور حکومت کی دور اندیشی سے امید کی جاتی ہے کہ صنعت اور تجارت میں وہ مشرق کو مغرب کا ہم پلہ بنا دے گی۔ جاپان جس طرح اسّی برس کے اندر گمنامی سے نکل کر صنعت اور سیاست کی بلندیوں پر پہنچا ہے اور مغربی قوموں کو انھیں کے اکھاڑے میں گھس کر

پہنچنے دئے ہیں وہ بھی ایک مثال ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

یورپ اور امریکہ کی سیاست اور تجارت اس وقت دنیا پر ایسی چھائی ہوئی ہے کہ جاپان کی مثال سامنے ہوتے ہوئے بھی کہنا پڑتا ہے کہ مشرقی دنیا ایک حد سے آگے ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ مغربی تمدن کو زوال نہ ہو۔ اس وقت کی بین الاقوامی پیچیدگیوں میں زوال کے بہت سے آثار نظر آتے ہیں لیکن روس اور امریکہ ایسی قومیں ہیں جو تصادم سے بالکل نہیں تو بڑی حد تک بچی رہیں گی۔ وہ صنعتی تہذیب کا سلسلہ قائم رکھیں گی اور اس تہذیب سے ملوکیت کا خارج ہو جانا بھی یقینی نہیں ہے۔ دوسری طرف ہندوستان اور چین، جو قدرتی دولت اور آبادی کے لحاظ سے مشرقی ملکوں میں سب سے ممتاز ہیں ابھی اپنی سیاست پر کوئی اختیار حاصل نہیں کر سکے ہیں۔ ستیاگرہ کی تحریک معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کو سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی ایک نئی اور نہایت کارگر تدبیر بتائے گی، لیکن اس کا آہستہ آہستہ ایک شخصیت پر دار و مدار ہو گیا ہے اور ہندوستان کی قومیت، جو بڑی مشکلوں سے ملوکیت کو دو چار قدم پیچھے ہٹا دینے میں کامیاب ہوئی تھی اب معلوم ہوتا ہے دینی اور تہذیبی اختلافات کے ہاتھوں دکھ اٹھائے گی لیکن انسان کی تدبیر اس سے کہیں زیادہ

دشوار منزلیں طے کر چکی ہے۔ مشرقی قوموں کو بہر حال دنیا کی تہذیب اور تمدن کو قائم رکھنے اور ترقی دینے کی ذمہ داری اپنے اوپر لینا ہوگی اور اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ صنعتی اور خالص تمدنی حوصلے سے کر اٹھیں گی اور باہمی مقابلے کے اسی چکر میں پڑ جائیں گی جس میں کہ مغربی قومیں مبتلا ہیں، یا صنعت اور تمدن کو کسی عالمگیر، پائداری اور سکون بخشنے والے دینی یا اخلاقی حوصلے کا خادم بنائیں گی۔

مصنف کی دوسری کتابیں

کیمیاگر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) کے مختلف افسانوں کا دلکش مجموعہ۔ طباعت وغیرہ خوبصورت۔ یہ افسانے اعلیٰ اور ستھرے مذاق کے طبقے میں عموماً پسند کئے گئے ہیں۔ عہ/

کھیتی از پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) مذہب اور اخلاق ہمیں کس راستہ پر چلانا چاہتے ہیں۔ زمانہ کی مصلحتوں اور قومی ضرورتوں پر گہری نظر۔ یہ ڈرامہ مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھ کر لکھا گیا ہے۔ جوان کی ذہنی اور قومی رہنمائی کیلئے ایک درس ہے کامیاب ۱۰/

انجام پروفیسر محمد مجیب نے انسان کو خود فریبی کے نمونے بڑی خوبی سے دکھائے ہیں اور جھوٹی مذہبیت کا پردہ ہٹا دیا ہے۔ ۱۰/

مکتبہ جامعہ دہلی